

# بُوں کی پڑ

یہکے از مطبوؤ عات نیشنل، اکاڈمی،

# بہول کے پیڑ

بوئے پیڑ بہول کے آم کھاں سے کھائے  
(کبیر)

## ایک آپ بیتی

راوی: ششنل کازناو  
مترجم: گوپال مشیل

ناشیں: میں کاظمی ۹۔ انصاری ماکیٹ دریانج دہلی

اشعات اول — مئی ۱۹۶۶ء

قیمت — پچاس پیسے

TITLE OF THE ORIGINAL : BITTER SEEDS

AUTHOR : STANLEY KARNOW

ORIGINAL PUBLISHER : DRAGONFLY BOOKS,

HONG KONG

کتابت: اطہر

(یونین پرمنگ پریس - دہلی ۶)

## تمہیں مید

"بہول کے پیر" لی چانگ کی آپ بیتی ہے جو دکنی چین کے کوانگ ٹنگ صوبے میں دریاۓ موئی کے کنائے ایک زرخیز خطہ میں رہتا تھا۔

کتاب کے مصنف شینلے کارناڈ نے کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے کہ لی چانگ کا کردار ایک ترکیبی کردار ہے لیکن لی کی آپ بیتی حقیقی ہے۔ اس آپ بیتی کی بنیاد ان ہزاروں ہہا جرین کے بیان کردہ راتعات پر ہے جو سر زمین چین کو چھوڑ کر ہانگ کانگ اور میکاؤ میں پناہ گزیں ہوئے۔ مصنف نے ان لوگوں کے حالات علوم کرنے کے لیے ان سے خود انٹر دیو کیے تھے۔ ان انٹر دیوؤں میں مصنف کے کئی برس سرف ہوئے لیکن ان کی بدولت مصنف کو چین کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہو گئی۔ کتاب کی بنیاد انہی معلومات اور ان سے حاصل شدہ بصیرت پر ہے۔

لی چانگ کے گاؤں پاکشان کے خدوخال مصنف کو ایک فوجوان مدرس نے فراہم کیے تھے جو کینٹن کے نواح سے بھرت کر کے آیا تھا۔ کئی ہہا جرین نے شینلے کارناڈ کو یہ بتایا کہ زرعی اصلاحات کے دور میں ان پر کیا گزری تھی۔ لیکن مصنف نے اس معاملے میں صرف ان ہہا جرین کی یادداشتول پر ہی بھروسہ نہیں کیا بلکہ کیونسٹ چین کی سرکاری مطبوعات نے بھی استفادہ کیا ہے۔

لی چانگ کے ترکیبی کردار کی تخلیق کرتے وقت مصنف نے اس بات کو محفوظ رکھا ہے کہ ہہا جرین کے بیان میں مبالغہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مبالغہ کا باعث ایک تو یہ بات ہوتی ہے کہ اپنی اہمیت جتنے کے لیے ہہا جر اپنی روادار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں، دوسرے یہ خدشہ بھی ہوتا ہے کہ وہ انٹر دیو کرنے والے کو خوش کرنے کے لیے اپنی بات کو کچھ نک مرچ لگا کر بیان کریں تاکہ سننے والے کو لطف آجائے۔ دیسے بھی جو کسی ملک سے بھاگنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگاتا ہے، اس سے بیان دائع میں مکمل حقیقت پندی کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔

ان خطروں سے دامن بچانے کے لیے مصنف نے بڑی ہی ریاضت کی ہے۔ صرف یہ ہی نہیں کہ اس نے ہباجرین کے بیانات تلمیند کرتے وقت دقيقہ رسی سے کام یا بلکہ اس نے صبر در سکون کے ساتھ مختلف بیانوں کا آپس میں موازنہ بھی کیا ہے اور ان بیانات کو معلومہ حقائق کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ اس طرح داستان میں مبالغہ آمیزی کا زنگ باقی نہیں رہا۔ پھر مصنف کی دل جیسی بنیادی طور پر منفرد راتقات سے نہیں بلکہ ان راتقات کے ایک ایسے مخصوص پہلو سے تھی جس کا اعادہ قریب تریب سمجھی داتانوں میں ہوتا تھا۔

مصنف کا یہ دعویٰ نہیں کہ لی چانگ کا کردار چین کے سچاس کردار کا نوں کی زندگی کی ہو بہو نمائندگی کرتا ہے۔ وہ اس کردار کو کو انگ ٹنگ صوبے کی پوری دیہی آبادی کا مقابلہ کردار بھی قرار نہیں دیتا لیکن اس کا یہ دعویٰ ضرور ہے اور یہ دعویٰ مکمل طور پر بجا ہے کہ لی کا یہ کردار ایک نمونے کا کردار ہے جس سے دیسی چین کی زندگی کا قریب قریب صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

لی چانگ کی کہانی کا مطالعہ ہندوستانیوں کے لیے خاص دل جیسی کا باعث ہونا چاہیے جیسی کی طرح ہندوستان بھی بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور اس کی بیشتر آبادی کسانوں پر مشتمل ہے کسی سیاسی نظام کی کسوٹی یہاں بھی بنیادی طور پر یہی ہو گی کہ ملک کی زرعی آبادی کے سائل کا اس کے پاس کیا حل ہے۔ اس اعتبار سے لی چانگ کی داستان ایک انتباہ ہے۔ اگر کتاب کے پڑھنے والے اس انتباہ کو سمجھ لیں تو اس کتاب کی اشاعت کا مقصد چورا ہو جائے گا۔

ہندوستان کے کسانوں کی حالت اب لی چانگ کی حالت سے بنیادی طور پر مختلف ہے لیکن کبھی لی چانگ بھی انہیں کی طرح آزاد اور خود مختار تھا۔ اس کی زبوں حالی میں اس کی کسی اپنی کو تباہی کو دخل نہیں تھا بلکہ وہ بے چارہ ایسے حالات کا شکار ہو گیا تھا جو اس کے قابو میں نہیں تھے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ حالات ہندوستان میں رونما نہ ہوں اور یہاں کے کسانوں کو لی چانگ کے انجام بد سے دوچار ہزمانہ پڑے۔

## گوپا متل

میرا آبائی وطن پاکستان تھا جو کنٹین کے عظیم شہر کے مشرق میں ۲۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ میرا نام لی چانگ ہے اور میں اپنے آبائی گاؤں میں آج سے ۳۰ سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اپنی بیشتر زندگی میں نے دیس گزاری اور اپنے آبادا جداد کی طرح میں بھی ایک کسان تھا۔ اس خطے میں آبادی کافی گنجان ہے لیکن نظرت اس پر کافی مہربان ہے۔ پانی کی بالعموم فراہدی رہتی ہے اور دھرتی اتنی زرد خیز ہے کہ سال میں چاول کی دو فصلیں ہو سکتی ہیں۔ مجھے بزرگوں نے بتایا تھا کہ اس علاقے کو قحط کی مصیبت سے کبھی دوچار ہونا نہیں پڑا اگرچہ چین کے بیشتر حصوں پر یہ مصیبت نازل ہوتی رہتی ہے۔ پھر بھی ناقص فصل اور انماج کی قلت کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے ہم ناواقف ہوں اور ہم میں سے ہر ایک کو یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر موسم خراب اور فصل ناقص رہی تو بجڑک کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ میرے خیال میں یہی وجہ تھی کہ ہم نوروز کے دن ہمیشہ نہ عالمانگا کرتے تھے کہ ہر اسازگار رہے اور بارش بر وقت ہو جائے۔

جب میں برسوں پہلے کی بات سوچتا ہوں، جب اتنی تبدیلیاں رونما نہیں

ہوئی تھیں تو مجھے یاد آتا ہے کہ میرا گاؤں صاف سکھرا اور پر سکون تھا۔ اس مرٹھانی سوئے قریب گھر تھے اور جیسا کہ ضلع کی آبادیوں کا عام قاعدہ تھا، کئی جگہ ان گھروں کے جھر مٹا۔ سے بنے سوئے تھے۔ کئی جھر مٹوں کے سامنے مچھلیوں کے نالب تھے اور باقی بڑی سڑک کے کنارے کنارے تھے۔ گاؤں کے کنارے پر بانسوں کے جھنڈتھے جیسے بھالر کی ہو۔ یہاں سے چاول کے کھیتوں اور سبزی کے باغات کی طرف راستے نکلتے تھے۔ راستوں کے کناروں پر آبپاشی کے لیے کھودی ہوئی خندقیں اور مٹی کے پچھوٹے پچھوٹے بند تھے۔ کئی جگہوں پر آڑوں اور امروं کے درخت تھے اور جگہ جگہ کئنے کے کھیت بھی تھے اور لمبے چوڑے میدان کے پرے سرخ مٹی کی پہاڑیاں تھیں۔ ان کی چلی ڈھنڈنے والے چاول کے کھیت تھے اور اونچائیوں پر جہاں سیلان کا گزر نہیں ہو سکتا تھا بزرگوں کی قبریں تھیں۔ کسی نہ کسی طرح یہ خیال ہمارے لیے تسلیم نجاش تھا کہ مُردوں کی رو حسیں اس منظر پر اب بھی مگاہ ڈال سکتی ہیں جس میں وہ کبھی جی لیتے تھے۔ ہمارے آبائی ہاں میں ایک تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا کہ لی قبیلے نے اس گاؤں پر چالیں نسلوں سے بھی پہلے قبضہ کیا تھا اور کسی زمانے میں ہمارا خاندان غالباً امیر زمینداروں کا خاندان تھا لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا زمین اولادِ نرینہ میں تقسیم ہوتی کئی حتیٰ کہ میرے والد کو درستے میں صرف چھ ماڈ زمین ملی۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نہ امیر تھے نہ غریب۔ ہمارے گھر کی حالت سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا۔

غريب کسان مٹی کی دیواروں اور پھونس کی چھت دالے جھونپڑوں میں رہتے تھے اور امیر جا گیردار بڑے بڑے دو منزلہ مکانوں میں رہتے تھے جو نقش و نگار والے

لہ ایک ماڈ ایک ایکڑ کے ۱۱۶ کے برابر ہے۔

ذرنچر سے آرائی ہوتے تھے۔ ہمارا ایک منزلہ مکان تھا جو مُرخ ایٹمیوں سے بنایا اور اس کی چھت سبز ٹالوں کی تھی۔ اسے میرے پردادا نے بنایا تھا اور اب یہ برقی طرح مرمت طلب تھا لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ گھر خوشگوار طور پر بھرا ہے اور چل پل دالا تھا۔ میرے دادا اور دادی ایک کرے میں رہتے تھے۔ گرمیوں کے مساواج بہم بچوں کو کنوں کے نزدیک باہر احاطے میں سرنے کی اجازت ہوتی تھی، میں اور میری دوچھوٹی بہنیں اپنے والدین کے ساتھ دوسرے کرے میں سوتے تھے۔ ہمارے علاوہ گھر میں بسا اوقات مہمان بھی ہوتے تھے۔ میرا ایک چھپا جو گنٹین میں رہتا تھا اور دوسرا جس کی رہائش ہانگ کانگ میں تھی، ہمارے لیے چکدار کاغذوں میں لپٹی ہوئی مٹھائی لایا کرتے تھے۔ اپنے خاندانی حلقة میں ہمارا وقت مرے سے کٹتا تھا۔ جب رشتہ دار آتے تو سب لوگ کافی رات گئے تک جائے اور کھانے پینے میں مصروف رہتے۔ ہم ہمارے بھی بڑے ذوق شوق سے مناتے تھے۔ مثلاً اثر دری کشی کا ہوار چاند کا ہوار اور سبے اہم ہوار نوروز، جس کے بعد بھی ایک ہفتے تک میرے کاؤں میں پٹاخوں کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ شادیاں اور جنم دن بھی بڑی شان سے منائے جاتے تھے۔ میرے دادا کا ساٹھوان جنم دن تو اس شکوہ سے منایا گیا تھا کہ اس کی کوئی نظیر میرے ذہن میں نہیں۔ مہمان سو سے زیادہ ہی ہوں گے۔ گنٹین اور ہانگ کانگ سے رشتہ دار آئے تھے اور اس پاس کی بستیوں سے بہت سے دوست احباب۔ کھانے کی میرے بھر سے باہر دو گلی تک چائی گئیں تھیں۔ جب دوپہر کے بعد کھانا شروع ہوا تو میرا دادا ایک میرے سے دوسری میرے پر جاتا اور چادر کی گرم شراب کے جام صحت نوش کرتا۔ ہمارا اسے طفرے میں کر رہے تھے جن پر متبرک مقولے لکھے ہوئے تھے۔ محصلی، مرغ اور گوشت کے طرح طرح کے

پکوان تھے اور ظاہر ہے کہ سوتیاں تو تھیں ہی۔ خور و نوش کا سلسلہ رات تک جاری رہا۔ ایسا کھانا کیونکہ کبھی کبھار ہی پکتا ہے اس لیے میں خوب جی بھر کے کھانا چاہتا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی مجھے نیند آگئی۔

اس کی سانحومیں سالگردہ کو کچھ زیادہ دن نہیں گز رے تھے کہ میرا دادا چل بسا۔ جب اس کا تابوت قبر میں رکھنے کے لیے پہاڑ کی چوٹی پر لے جایا گیا تو ہم سب کو سفید بادے پہنچنے پڑے۔ چند ہفتے کے بعد میری ماں نے مجھے بتایا کہ اس کی روح ہمارے گھر میں واپس آگئی ہے اور سامنے کے کمرے کی ایک تختی میں رہنے لگی ہے۔

بھر حال یہ تیاس کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ ہمارے یہاں ہر روز ہی دعویٰ میں اڑا کر تھیں، اکثر اوقات ہم کرم کرنا یا کسی دوسرا سبتوں کی کچھ سماں چاول ہی کھاتے تھے اور میرا خیال ہے کہ گوشت یا چھلی ہمیں ہفتے میں دو میں بار سے زیادہ نہیں ملتی تھی۔ اور یہ بھی نہیں کہ ہم ہر وقت موجود ہی اڑاتے۔ ہم کے برعکس مجھے یاد یہ پڑتا ہے کہ ہم سب کڑی محنت کرتے تھے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام سامنے رہتا تھا۔ موسم بہار میں صحیح سورے میرا بابا پ اپنے کھیستوں میں ہل چلاتا۔ ہل میں بوہے کا پھل لگا ہوتا تھا اور اسے ایک بھینسا کھینچتا تھا جسے میرا بابا پ جاگیر دار سے کراٹے پر لیا کرتا تھا۔ تب خاندان کا ہر فرد جس میں میری دونوں چھوٹی بہنیں بھی شامل ہوتی تھیں کھاد کی ٹوکریاں بھر بھر کے کھیستوں میں ڈالتا تاکہ زمین زرخیز ہو جائے۔ تب میرا بابا پ بند کاٹ کر کھیت میں پانی چھوڑتا اور ہم تھمی پوٹے لا لا کر قطاروں میں لگانے لگتے۔

آئندہ ہیئے ڈیڑھ ہیئے تک ہمارا کام ہی ہوتا کہ ہم پانی کو سوکھنے نہ دیں۔ جب چھٹائی کا وقت آتا تو پورا خاندان کام میں جٹ جاتا تھا کہ میری بڑھی دادی بھی۔ ہماری کریں جھکتے جھکتے چور ہو جاتیں اور ہمارے چہرے و صوب سے تمانے لگتے۔ خوش قسمتی ساتھ دیتی توجون میں چاول کی سہری ڈنڈیوں سے کھیت جلگ جگائ کرنے لگتے۔ یہ وقت بڑا ہی صبر آزمائیں کیونکہ اگر کہیں زور کی بارش آجائے تو سارا کھیت اتھل تھسل ہو جاتا اور فصل تباہ ہو جاتی۔ اس زمانے میں ہر کسان خواہ وہ مطلقاً دہمی نہ ہو، دیوماؤ سے پر ارتھنا ضرور کرتا تھا جن کے بت گاؤں کے باہر ٹوٹ والی کے مندر میں رکھے ہوئے تھے۔

جیسے ہی ہم چاول کی اس پہلی فصل کو اکٹھا کرنے، اسے گاہنے اور چپکے آئانے کے لیے نزدیکی مل میں بھیجنے سے فارغ ہوتے، ہم دوسرا فصل کے لیے بل چلانے اور نیچ ڈالنے میں مصروف ہو جاتے جو موسم خزان میں بھی تھی۔ چاول کی دنوں فصلوں کے دوران اور ان کے بعد ہمیں اپنے ترکاریوں کے باع پر بھی توجہ صرف کرنی پڑتی تھی جہاں ہم سیم پیاز اور بہت سی دوسری اقسام کی سبزیاں اگاتے تھے۔ ہمارے پاس کچھ مرغیاں بھی تھیں اور اگر ہم میں استطاعت ہوتی تو ہم ایک سوڑ بھی پال لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انھیں بھی ہماری توجہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہمیں اپنی فصل کا کچھ حصہ منڈی میں فروخت کے لیے بے جانا پڑتا تھا تاکہ ہم نک، تیل، کیروسین، جڑی بٹیوں اور شادی غمی کے آئندہ اخراجات کے لیے تھوڑی بہت نقدی حاصل کر سکیں۔ بہر حال غریب کا نوں تو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کا سامنا ہمیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ بیچاۓ

تو ہمیشہ مفروض رہتے تھے اور اپنے مردوں کی تدبیں کے لیے جگہ خریدنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے تھے۔ خود ہمیں بھی یہ بھڑکا لگا رہتا تھا کہ اگر فصل اچھی نہ ہوئی تو ہم بھی افلس کے غار میں گر سکتے ہیں۔

پہلے پونکہ اکتوبر کا تھا اس لیے کہیں تو میں بیرے ہے کام کرنے ضروری تھا لیکن میرزا باب پہ محسوس کرتا تھا کہ اگر میں تعلیم حاصل کر دوں تو اپنے لیے بھی اور اپنے خانہ کے لیے بھی زیادہ مفید ثابت ہو سکوں گا۔ جب میری عمر گیارہ سال کی ہوئی تو وہ مجھے نواحی گاؤں یا نکنگ میں لے گیا۔ وہاں ہم منڈی میں بھی گئے اور میرے باپ نے میرا نام سکول کے جھٹر میں بھی درج کر دیا۔ یہ سکول ایک ٹوٹے پھرٹے مکان میں صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ وہاں مختلف عمر والوں کے بچے ایک بنخ پر میٹھے ہوئے تھے اور وہاں آنا شور شراپ تھا جیسے نوروز کا جشن منایا جا رہا ہو۔ ہم سب اپنے ہاتھ میں کتابیں کر کر اونچی اونچی آواز میں ان الفاظ کو جھینیں ہم نے رٹ رکھا تھا دھرا یا کرتے تھے اگرچہ یہ مجھے مطلق معلوم نہیں تھا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؛ ہمیں کنفیوشن کی تعلیمات بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ سکول میں مجھے یہ بھی سکھایا گیا کہ گنتی کی سلیٹ سے کس طرح کام لیا جاتا ہے جس کی بدولت حساب میرے لیے کافی دلچسپی کا باعث بن گیا۔ اگرچہ سکول میں مجھے کافی دلچسپی تھی لیکن یہ میرے لیے ایک بوجھ بن گیا۔ گھر سے سکول تک کا پیدل سفر حالیں منٹ کا تھا۔ پڑھائی صبح آٹھ بجے شروع ہو جاتی تھی اور دن کے چار بجے تک جاری رہتی تھی۔ یہ بات میرے باپ کے لیے ممکن نہیں تھی کہ وہ مجھے اتنی دیر تک گھر سے دور رکھ سکے۔ کئی بار کہیں تو میں میری ضرورت پڑ جاتی اور مجھے

سکول سے غیر حاضر ہنا پڑتا۔ ان بار بار کی رکاوٹوں کی وجہ سے میں پڑھائی میں پچھے رہ گیا اور بالآخر میں نے سکول جانا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ آج بھی میں اپنی طرح لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ ایک بار میرے باپ نے افسوس بھی کیا تھا کہ اسے مجھے سکول سے اُٹھانا پڑتا۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے لیے کھیست میں کام کرنا زیادہ ضروری تھا۔ مجھے اپنی کم علمی کا افسوس ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تھیک کہتا تھا۔ اگر پہٹ بھر کھانے کے لیے نہ ہو تو پڑھنا لکھنا کس کام کا؟

جب بیلی بار میں نے شمالی چین میں ہونے والی جنگ کی کہانیاں سنیں تو میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گی۔ لیکن یہ جنگ ایک دور کی چیز تھی اور کوئی شخص ان کہانیوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ کچھ دن کے بعد یہ افواہیں پھیلنے لگیں کہ جاپانی ہمارے خطے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک رات ہم نے مشرق میں گرگڑا ہٹ کی آواز سنی۔ ایک یا دو دن کے بعد کنٹین سے میرا چھا آگیا۔ وہ بہت تحکما ہرا اور مضطرب تھا۔ میرا باپ اور اس کے دوست اس کے گرد جمع تھے اور وہ یہ بتا رہا تھا کہ جاپانیوں نے شہر پر کس طرح حملہ کیا۔ اس نے ہواں حملوں، تباہی اور مصیبت کی باتیں کیں اور بتا یا کہ کس طرح اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ شہر کے گلی کوچوں میں لاشیں بھری پڑی ہیں۔ اس کا بیان کافی خوفناک معلوم ہوتا تھا۔

میرے چھانے بتایا کہ جاپانی ایک ہفتے کے اندر اندر ہمارے گاؤں میں ضرور در داخل ہو جائیں گے۔ کچھ کسانوں نے جو اس کی بات سُن رہے تھے کہا کہ ہمیں ان کے استقبال کی تیاریاں کرنی چاہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس سوال پر کافی گرام بحث ہوئی تھی کہ ہمیں کیا کہنا چاہیے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ اس وقت کیا کچھ کہا گیا لیکن آخر میں شخص

اس پر مستفت ہو گیا تھا کہ ہمیں صرف چپ چاپ مبینہ کر انتظار کرنا چاہئے اور یہی ہم نے کیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا اور اس کے بعد دوسرا بھی لیکن کوئی جاپانی ہمارے گاؤں میں نمودار نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی جاپانی ہمارے گاؤں میں کبھی آیا ہی نہیں۔ غالباً ان کے نزدیک ہمارا گاؤں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے مایوسی ہوئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے خیال میں لڑائی سے جو جوش و خروش پیدا ہوتا اس سے ہماری زندگیوں کی بے کیفی میں تھوڑا بہت فرق پڑتا۔ بہر حال بہت جلد ہم اپنی پہلی زندگی پر بوٹ آئے اور ہر چیز پر انے ڈھرتے پر چلنے لگی۔

ان برسوں میں اگر کچھ واقعات رونما ہوئے بھی تو وہ گھریلو قسم کے تھے۔ موسم گمراہ میں میری دادی مر گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چاول کی بیلی فصل کاٹی جا چکی تھی اور موسم خرداں کی فصل ہونے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ایک سال بھی نہیں گزر اتنا تھا کہ میری دو بہنوں میں سے بڑی کی شادی ہو گئی۔ اس کی عمر پندرہ برس تھی اور وہ مجھ سے چار برس پہنچنے لگی۔ میرے والدین نے اس کے لیے جو دولٹا منتخب کیا وہ میری ماں کا پچھرائیا تھا اور یا نانگا کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اپنی بہن کی شادی کی طرف اپنے باپ کا روپیہ میرے لیئے ناقابلِ فہم تھا۔ ایک طرف، وہ اس بات سے خوش نظر آتا تھا کہ اب کھانا کھانے والوں میں ایک کو کمی ہو جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے افسوس بھی تھا کہ اب میری بہن کھیت کے کاموں میں ہاتھ نہیں بٹا سکے گی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ جہیز کی لگت پر کڑھ رہا ہے۔ جہیز میں لکڑی کی ایک اماری، دو گرسیاں اور ایک خوبصورت شیشہ شامل تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ اس بات سے اسے کچھ تسلی ہے کہ دولٹا کے دالد کو

بھی شادی پر کافی خرچہ پڑے گا جسے ایک بہت بڑی دعوت دینی تھی۔ دعوت واقعی شاندار تھی۔ شادی کے بعد میری بہن اپنے سسرال چلی گئی۔ اس کے بعد اس سے میری ملاقات دو تین بار ہی ہو سکی۔

تقریباً ایک سال بعد، جیسی کہ مجھے اُمید تھی، میری شادی کی نوبت بھی آگئی۔ میری عمر بیس برس تھی اور جو سچ پوچھو تو میں عورت کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ لہذا جب میرے باپ نے شادی کی بات کی تو میں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ پھر یہ میرا فرض بھی تو تھا کہ شادی کر دیں اور بیٹے پیدا کر دیں۔ اگر شادی کا خیال مجھے ناپسند بھی ہوتا تو بھی اس کی مخالفت کرنا سعادت مندی کے منافی ہوتا۔

میرے لیے بیوی منتخب کرنے کا فرض میری ماں نے انجام دیا۔ وہ اپنے میکے یانکنگ میں کئی بار گئی اور ایک دن مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم بندھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نواحی گاؤں میں پہنچے جہاں ہم اس کے ایک چھپرے بھائی کے گھر گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کی چھت گھاس پھوس کی تھی۔ میں نے فوراً اندازہ لگایا کہ جن لوگوں کے گھر ہم آئے ہیں وہ نسبتہ ہم سے غریب ہیں۔ گھر میں ایک نوجوان لڑکی اور اس کی ماں کے علاوہ ایک بوڑھی عورت بھی تھی جو رشتے ناطے کر انے میں ماہر تھی۔ ہماری چائے اور کیکوں سے تواضع کی گئی۔ زیادہ با تیس میری ماں اور اس بوڑھی عورت کے درمیان ہی ہوئیں۔ میرے خیال میں میری ہونے والی بیوی کافی نوجوان تھی، اس نے عصان سستھرا بابس پہن رکھا تھا اور وہ کافی خوبصورت بھی تھی۔ بعد میں جب میری ماں نے میری رائے پوچھی تو میں نے جواب دیا "اگر تم تھاے اور والد کے نزدیک یہ لڑکی مناسب ہے تو میں اس سے شادی کر لیوں گا"۔ اب شادی کے رسم درواج کافی مختلف ہیں لیکن اس وقت دہن اور دو طھا اس

وقت تک ایک دوسرے سے ملنہیں سکتے تھے جب تک شادی واقعی نہ ہو جائے جو بالعموم سکالی کے چھے یا سات ہفتے بعد ہوتی تھی۔ بالآخر جب رسومات کی ادائیگی کا وقت آگیا تو میں نے سیاہ رشیم کا گون پہننا اور اپنے گھر کے دروانے پر گھڑا ہو گیا۔ جلد ہی میری والہن بھی پہنچ گئی۔ رواج کے مطابق اسے ایک سرخ ڈولی میں بٹھا کر لا یا گیا تھا۔ اس نے سرخ بانات کا شاندار لباس پہن رکھا تھا اور اپنے سراور چہرے کو سرخ رشیم کی نقاہ سے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اسے گھر کے اندر لا یا تو پہاڑے چھوڑے گئے۔ گھر میں جا کر تم نے اپنے بزرگوں کی آشیرواد حاصل کرنے کے لیے گوشه مقدس میں سجدہ کیا۔ اس کے بعد تم بڑے بال میں کھانا کھانے بیٹھ گئے جو کافی رات تک جاری رہا۔ دوسرے دن ہمیں پھر خاندانی بال میں لے جایا گیا جسے سرخ کاغذ کی جھالروں سے سجا یا گیا تھا اور وہاں موم بٹیاں اور خوشبوئیں بل رہی تھیں۔ ایک بار پھر ہم نے سرہ سجدہ ہو کر بزرگوں سے دعا میں مانگیں۔ باہر پڑا خون کا شور بہت زیادہ تھا۔ تجوہ، شور شرابے اور خوشبوئیات کی درجے سے مر اس رجھ کر انے لگا لیکن ہم ایک اور دعوت میں شرکیں ہونے چلے گئے۔ اتنے لوگوں نے جامِ صحبت تجویز کیے کہ قریب قریب مجھے نشہ چڑھ گیا۔ تنہائی میں اپنی بیوی سے میں کئی دن کے بعد ہی مل سکا۔

جس طرح میرا باب میری ماں کو اپنے آبائی گھر میں لے آیا تھا، میں بھی اپنی بیوی سے کو اپنے گھر لے آیا۔ بہت سی دوسری والہنوں کے برلنکس جن کا اپنی ساسوں کے ساتھ بسا اوقات اچھی طرح نباہ نہیں سوتا، میری بیوی نے میری ماں کا دل موه لیا۔ وہ ایک غریب گھر سے تھی اور محنت شاہ کی غادی تھی اور وہ آبائی دیوتاؤں کی مناسب طریقے سے پستش بھی کر سکتی تھی۔ میری ماں ان باتوں سے خوش تھی۔ میری غیر شادی شدہ بہن کے ساتھ بھی میری بیوی کا ردیہ ہمیلیوں جیسا تھا۔ میری شادی کے تقریباً ایک سال

بعرہماں سے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا جو ایک لڑکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے باپ نے میری بیوی کی طرف منظاہرہ شفقت کی ابتداء اسی وقت سے کی۔

انہی دنوں ایک مرتبہ ہم نے مشرق میں آسمان پر گھن گرج کی آواز سنی اور اوپر ہواں جہازوں کو اڑتے دیکھا۔ جلد ہی ہمیں محسوس ہو گیا کہ جایاں لٹنیں سے چلے گئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے مرکزی حکومت کے جھنڈے خردیدیے اور انھیں اپنے گھروں پر لہرا دیا۔ یہ جھنڈے سرخ، سفید اور نیلے رنگ کے تھے۔ بہر حال ان دنوں گاؤں کے بیشتر لوگوں کے لیے ایامِ امن اور ایامِ جنگ میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اور میرے خیال میں میرے ذہن میں اس کا بلکہ ساتھی تصور بھی نہیں تھا کہ حکومت کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ البتہ یہ مجھے معلوم تھا کہ صوبے پر افسروں کی حکومت ہے اور جنرل چینگ کا لی شیک کا نام بھی سنبھلے سن رکھا تھا جس کی راجدھانی شمال میں تھی۔ لیکن اس بات کے علاوہ کہ بھی کبھی سکیں کلکٹر گاؤں میں آ جاتا تھا، حکمران افسروں میں کچھ زیادہ پریشان نہیں کرتے تھے۔ سچ پوچھو تو ٹیکس کلکٹر کا دورہ بھی زیادہ کامیاب نہیں رہتا تھا۔

اب جب میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو اس بات کی وضاحت کرنا کافی آسان ہے کہ گاؤں میں حقیقی اقتدار کن لوگوں کے ہاتھوں میں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اقتدار کی دو قسمیں تھیں۔ ایک کاغذی اقتدار اور دوسرا حقیقی اقتدار۔

کاغذی طور پر ہماں یہاں جو قدیم نظام اقتدار جاری تھا اسے پاکا پ نظام کا نام دیا جاتا تھا۔ ہر دس خاندان مل کر ایک گروپ بنایتے تھے جو کاپ کبلاً تھا اور ہر دس کاپ مل کر ایک پو بناتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں تین پو تھے اور ان میںوں کے بیڈر

ہیونگ میں گاؤں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہیونگ ایک دینج تراکائی تھا جو ہمارے ضلع کے چھ دیہات پر مشتمل تھا جہاں تک میرا خیال ہے ہیونگ ضلع ایڈمنسٹریشن کے تحت تھا جس کی راہنمائی صوبہ کوانگ ٹانگ کا گورنر کرتا تھا۔ پوکاپ کے نظام کو کاغذی نظام اقتدار کا نام میں اس لیے دیتا ہوں کہ فی الواقعہ اس پر عملدر آمد نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں کا کوئی بھی قابل قدر شخص پویا کاپ کا یڈر بننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا کیونکہ یڈر کو جو کام کرنے پڑتے تھے ان میں اس قسم کے کام بھی تھے کہ جب ٹیکس کلکٹر گاؤں میں ٹیکس جمع کرنے آئے تو وہ اس کے ساتھ تعاون کرے۔ یہ ایک ایسا نام قبول کام تھا کہ کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔

حقیقی اقتدار کا مرکز ہمارے گاؤں میں کوئی اور تھا۔ یہ اقتدار کچھ اور گروپوں کے ہاتھ میں تھا۔ ہم لوگ اپنے بزرگوں کا چونکہ بڑا احترام کرتے تھے بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ہم ان کی پرستش کرتے تھے اس لیے قبائلی تنظیمیں بہت مقدار تھیں۔ وہ قبیلے کے اندر خاندانی جھگڑا کا فیصلہ کرتی تھیں اور کچھ کبھی قبیلوں کی آپس میں جنگ بھی ہو جاتی تھی۔ اگرچہ قبیلے کے کچھ ممبروں کے پاس پرانی بندوقیں بھی ہوتی تھیں لیکن لڑائی ہمیشہ پتھروں اور بانس کے ڈنڈوں سے ہی ہوتی تھی۔ دوسرا مقدر گرد پ امیر جاگیر داروں کا تھا۔ بلیشور غریب کا نوں پرانا کالگان واجب الادا ہوتا تھا اور وہ جب بھی چاہتے کسی خاندان کو بھوکوں مرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ جاگیر داروں میں بلیشور نرم دل تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کچھ جاگیر داروں نے کمیرے کا نوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے غنڈے پال لکھے تھے۔

قبائلی انجمنوں اور جاگیر داروں کے علاوہ کسانوں کی حفاظتی انجمنیں بھی تھیں۔

یہ انجمنیں ہم سے ٹیکس وصول کرتیں اور اس کے بدلتے میں ہمیں یہ یقین دلاتیں کہ چوروں اور لڑیروں کے ٹولیوں سے ہماری فصلوں کی حفاظت کی جائے گی۔ بعض بوگوں کا

کہنا یہ تھا کہ ہمارے علاقے میں چوریں ہی نہیں بلکہ حفاظتی انجمن کا سدر بجا کے خود لٹیرا  
تھا جو ہم پر سیکس لگا کر اپنے چ س گھروں اور جوئے خافوں کے لیے سرمایہ فراہم کرتا تھا۔ دوسرے  
طرف دوسرے لوگ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہمارے گاؤں میں گڑ بڑاں لیے نہیں ہوتے کہ  
انجمن لٹیروں کو تجھے دے دلا کر ان کے ساتھ معاہدے کر لیتی ہے اور ان معاہدوں کی وجہ  
سے وہ بھیں ہمارے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بہر حال حفاظتی انجمن کو سیکس ملارہتا تھا  
اور ہم اپنے کام کا جیس مصروف رہتے تھے۔

شکایت کرنا کافی کا شیوه ہے، خواہ حالات کتنے ہی اچھے ہوں۔ مجھے  
یاد ہے کہ کس طرح میرا باب اور اس کے دوست بڑی سرگرمی سے "بیتے سنہرے دنوں"  
کی باتیں کیا کرتے تھے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جو لوگ ان "بیتے سنہرے دنوں" میں  
رہتے ہوں گے وہ بھی یہی سمجھتے ہوں گے کہ قدیم تر ماضی کا زمانہ اس زمانے سے بھی  
بہتر زمانہ تھا۔ بہر حال گز شہہ ایام پر نظر ڈال کر میں پوری ایمان زاری سے یہ کہہ سکتا ہوں  
کہ اپنی تمام سختیوں اور مصیبتوں کے باوجود ان دنوں ہماری زندگی، پیش آنے والے  
دنوں کے مقابلے میں زیادہ بُری نہیں تھی۔

**سیاست** نیرے داغ سے بالا تر چھڑے اور مجھ سے یہ توقع رکھنی فضول ہے  
کہ میں چین میں رونما ہونے والے واقعات کو پڑھنے لکھے لوگوں کی طرح بیان کر سکوں۔  
بہر حال اتنا مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۹ء میں جب میری عمر تقریباً چوبیں سال تھی ہمارے کان  
میں اس قسم کی خبریں پڑنے لگیں کہ ایک اور جنگ ہمارے علاقے کی طرف بڑھ رہی ہے۔  
پہلے ہم نے یہ صحہا کہ شاید جا پانی ہی والی پس آ رہے ہوں لیکن بہت جلد ہمیں پتہ چل گیا کہ

نئی خوجوں کا نام گنگ چاننگ ہے یعنی کیونٹ۔ انھوں نے قومی حکومت کو نانگنگ میں اس کی راجحانی سے بچھا دیا تھا اور اب وہ جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ ہی تاریخ بعد ہمارے گاؤں میں کٹیں سے لوگ آنے لگئے جیسا کہ گریٹر کے آیام میں اکثر ہوتا ہے۔ آنے والوں میں میرا چھا بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ پسپا ہونے والی سرکاری فوجوں نے دریائے موتی کا ہوشیار پل اڑا دیا ہے اور اب کٹیں میں ہر طرف افراتفری کا دور دورہ ہے۔ اس نے بتایا کہ حالت جایانی حملے کے وقت سے بھی کچھ زیادہ خراب تھی۔

کئی ہفتے سے مکیزیٹوں کی بے جمی کے متعلق انواہیں بھیل رہی تھیں۔ ہم گاؤں والوں کو بدترین خدشات تباہی سے تھے۔ کچھ امیر جاگیرداروں نے اپنا سامان بازدھا اور ہانگانگ بھاگ کے لیکن بہت جاگیر اگر گاؤں سیس ہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں سے ایک ہر سی کو یقین دلاتا پھر تھا کہ کچھ بھی نہیں ہو گا، کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ اس کا کہنا تھا "تمام بادشاہ ایک جیسے نہ تھے ہیں" اور اکثر لوگ صحیتے تھے کہ اس کی بات معقول ہے۔ ذاتی طور پر میری سمجھیں نہیں آتا تھا کہ کیا رائے قائم کر دوں۔ بالآخر مسلم خزان کی فصل سے کچھ پہلے ایک دن جب دھوپ خوت بھیلی ہوئی تھی، کیونٹ سپاہیوں کا ایک ستہ ہمارے گاؤں میں وارد ہو گیا۔ انھوں نے روئی کی سبز یونیفارمیں اور ریٹر کے تلے دالے جو تے پین رکھتے تھے۔ چند ایک نئے صرخ جھنڈے بھی اٹھا رکھتے تھے جن پر زرد نایے کے نشان بنے ہوئے تھے۔ وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو ہم ڈرتے ڈرتے انھیں دیکھتے رہے لیکن جلد ہی ہم نے محسوس کیا کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کہانیوں کے مقابلے میں جو ہم نے سپاہیوں کے متعلق سن رکھی تھیں، ان سپاہیوں کا اظر عجل کچھ ہند بانہ ہی تھا۔ انھوں نے نہ چوری کی، نہ لوٹا اور جو چاول اور سبزیاں انھوں نے لیں ان کی مرد جہہ شرح کے مطابق قیمت بھی دی۔ کسی شخص سے بُرا سلوک نہیں کیا گیا اور شروع شروع شخص یہی کہتا تھا کہ زندگی معمول کے مطابق اپنے دھرے پر جاتی رہے گی۔ ہم نے اسی رذہ اپنی چاول کی فصل اکٹھی کی اور یانگنگ کی منڈی کی شرح پر اپنی سبزیاں فروخت کیں۔

چند ہفتے تک ماحول ہی طرح پر سکون رہا۔ کم سے کم ہم نے محسوس ہی کیا لیکن جلد ہی مجھے محسوس

ہونے لگا کہ جہاں تک امر واقعی کا تعلق ہے ہمارے گاؤں میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ کیونٹ افسر نے اس مطلب کے پوشرچا پر کہے کہ حکومت کا پوکاپ نظام اب ختم کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ عوام پر "جزر" کرتا تھا۔ اس بات پر ہم نہیں دیے کیونکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں پوکاپ کے کاغذی اقتدار کی ہم لوگوں نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی لیکن جب یہ بات ہصلی کہ کسانوں کی خواستی انہم کو تکمیل کی جائی اب خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے تو ہم نے محبوس کیا کہ کیونٹ واقعی سنجیدہ ہیں۔ یہ بات میرے ذہن میں کبھی نہیں آئی تھی کہ کوئی اس انہم کو تکمیل کر سکتا ہے۔

اس انہم کے خلاف کارروائی کے ساتھ ہی گاؤں بھر میں سمجھیاں گی تلاش شروع ہو گئی اور پہلی بار ہم پتہ چلا کہ کیونٹ کتنی سختی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے انہم کے ممبروں اور قبیلوں کے میڈروں سے کئی گفتگو تک پوچھتا چھک کی اور جب ان لوگوں نے اپنی رانفلیں ان کے حوالے کیں تو انہیں بڑی طرح پیٹا گیا۔ کئی ایسے لوگوں کی بھی بڑی طرح مارپیٹ کی گئی جو سمجھیاں گی ان کے معاملے میں کچھ نہیں جانتے تھے لیکن کیونٹوں نے اپنی کسی غلطی پر انہمارا افسوس نہیں کیا۔ ان کے ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ ہمیں غنڈوں سے نجات دلانی جا رہی ہے جو ہمیں خوفزدہ کرتے تھے اور جوئے خانوں اور رہپس گھروں سے ناجائز روپیہ کھاتے تھے۔

میرے لیے ایمانداری کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ میرے دل میں ان چند لوگوں کے لیے بن کے ساتھ کیونٹوں نے بسلوکی کی کوئی خاص سہر دی تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعض عاملوں میں کیونٹوں کے طور طریقے کچھ زیادہ ہی سخت اور غیر منصفانہ تھے۔ مثال کے طور پر اس سلوک کو دیکھیے جو ہمارے گاؤں کے ایک معمر آدمی نگ شاؤ ٹزی کے ساتھ کیا گیا۔ اس کا تعلق کسی امیر خاندان سے نہیں تھا لیکن اپنے لڑکپن میں اس نے کٹیں میں تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی اور اس کی دانشمندی کے لیے سب اس کا احترام کرتے تھے۔ اکثر جب لوگوں کو اپنی نصل منڈی میں لے جاتی ہوتی یا اپنے بچے کا سکول میں داخل کرنا ہوتا تو اسی سے مشورہ کرتے۔ میرا خیال ہے کہ کیونٹوں نے یہ باتیں سن لی ہوں گیں

اور شاید انہیں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہونہ ہو دہ بھی کوئی سرکاری آدمی ہے۔ ایک رات پاہی اس کے مکان میں زبردستی داخل ہو گئے جہاں انہیں چاندی کی کچھ چیزیں نظر پڑ گئیں۔ پاہیوں کے انچارج افسر نے کہا کہ کسانوں کے پاس بالعموم اس قسم کی عمدہ چیزیں نہیں ہوتیں لہذا لنگ نے ضرور کہیں سے چراہی ہوں گیں۔ اس کے بعد اس نے لنگ پر یہ الزام لگا یا کہ اس نے ہتھیار پھپٹا رکھتے ہیں اور وہ چیانگ کافی شیک کی کیوں نہیں کیا۔ اس نے اور بھی کوئی قسم کے الزام اس پر لگائے جو مجھے یاد نہیں۔ لنگ نے ان تمام الزامات سے انکار کیا لیکن پھر بھی وہ اسے اعلیٰ حجی مشقیت کے کمپ میں لے گئے۔ اس کے بعد ہمیں اس کا کچھ پتہ نہیں چلا لیکن پچھے ہینے کے بعد جب وہ گاؤں واپس آیا تو پہلے سے کہیں زیادہ بُرھا نظر آتا تھا۔ کوئی شخص اس سے بات کرنے کی جا رہت نہیں کر سکتا تھا، کون جانے وہ بھی کسی مصیبت میں پڑ جائے۔

جب کیونٹ غنڈوں کی پکڑ دھکر طیں مصروف تھے تو انہیں دنوں گاؤں میں پانچ نوجوان سولیں نمودار ہوئے جنہیں کاپو کہا جاتا تھا۔ انہوں نے کسانوں کی طرح پرانے سیاہ سوٹی کپڑے اور جیلپین رکھتے تھے اور ان کے نرم دنمازک ہاتھوں اور ان کی بات چیت کے انداز سے ہم لوگ بآسانی یہ اندازہ لگانا سکتے تھے کہ وہ دیہاتی لوگ نہیں لیکن وہ بڑے آرام سے گاؤں میں گھومنے رہے، لوگوں سے ملتے رہے اور کہی سے مروت کے ساتھ بات چیت کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں سے دو ایک شام ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے مجھ سے اور میرے باپ سے تحریم کے سوال دریافت کیے مثلاً یہ کہ کیا ہم کسی کے مقدمہ ہیں؟ یا یہ کہ کیا کبھی کسی میر جا گیر دار نے ہمیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے باپ نے صاف صاف جواب دیے اور کہا کہ اگرچہ ہم کبھی کبھی ادھار لیتے رہے ہیں لیکن اس وقت ہم پر کوئی قرض نہیں اور جہاں تک جا گیر داروں کا تعلق ہے وہ ہمیں پرداشان نہیں کرتے تھے کیونکہ جوز میں ہمارے پاس تھی، ہم ہی اس کے مالک تھے۔ ایک کاپنے دریافت کیا کہ کیا کبھی جا گیر دار نے ہماری زمین ہتھیانے کی کوشش لے نام نہ پر عملے کے رکن کر کرتے ہیں۔ مراد ایک ایسے کامنہ سے ہے جس کے ذریعے کیونٹ پالیسیوں کی تکمیل ہوتی ہے۔

کی تھی۔ میرے باپ نے اس کا صرف یہ جواب دیا کہ ہم اپنے قرن ادا کرتے رہے ہیں اور ہر قسم کے جھگڑوں سے بچتے رہے ہیں۔ اس کے بعد کانپوٹھیں میٹھیں باتیں کرتے رہے ہیں اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کے متعلق پوچھتے رہے، کیا یہ سچ ہے کہ فلاں فلاں شخص اور فلاں فلاں شخص غریب۔ ہم نے انھیں بتا دیا کہ کون کون زمین کا مالک ہے اور کون کون زمین بٹائی ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں جنھیں ہر کوئی جانا شکستہ یاد پڑتا ہے کہ جب وہ چلے گئے تو میں نے سوچا تھا کہ میں کئی لوگوں کے متعلق ایسی باتیں جاننا ہوں جو انھیں مشکل میں ڈال سکتی ہیں۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ کچھ کسانوں نے وہ تمام کہانیاں انھیں سنادیں جو انھوں نے سُن رکھی تھیں۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں زبان ایک تیر تلوار ہے اور خون بہائے بغیر بلاک کر سکتی ہے۔

کانپوٹوں نے جو کہانیاں اور شکایتیں سنیں وہ سب کی سب نلط نہیں تھیں۔ کئی غریب کسانوں کی یہ شکایت بجا تھی کہ ان کے قرضوں پر بہت انسچا مود لیا جائے تھا اور زمین کا لگان بھی بہت زیادہ تھا۔ کانپوٹوں نے ان شکایتوں کو بڑی ہمدردی سے سنائیں۔ میرے لیے یہ کہنا آسان نہیں کہ انھوں نے یہ علوم کرنے کی کجھی کوئی حقیقتی کوشش کی کہ جو شکایتیں انھوں نے سنی ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط۔

میرا خیال ہے کہ یہ بات پوچھ چکھ شروع ہونے کے کئی ہفتے بعد ہی میری سمجھ میں آئی کہ کانپوڈر حقیقت چاہتے کیا ہیں۔ وہ گاؤں میں ان لوگوں کا پتہ چلانے کی کوشش کر رہے تھے جو سب سے زیادہ مفلوک احوال ہوں اور جن کے دلوں میں سب سے زیادہ تلمذی ہو۔ سال ۱۹۵۴ء کے اوآخر میں جب نئی کان انجمن قائم کی گئی تو سب سے پہلے اس میں انھیں کسانوں کا تقدیر ہوا۔ بعد میں ہم لوگ بھی اس انجمن میں شامل ہو گئے کیونکہ

ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ ہمیں اپنی چاول کی پیدا وار بڑھانے میں مدد سے گی اور ہمارے مفاہات کا تحفظ کرے گی۔ ایک کانپنی نے ہمیں بتایا کہ امیر جاگیر داروں، امیر کسانوں اور ان لوگوں کو جنہیں اس نے "جاگیر دارانہ عناصر" کا نام دیا تھا۔ اس انجمن میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی اس لیے ہم بے کھلکھلے اس میں شامل ہو سکتے ہیں اور اس میں شامل ہونا ہی داشمندی ہے۔

**باقی** سب کی طرح میں بھی اس بات پر حیران ہو رہا تھا کہ کمپنی نے ہمارے گاؤں میں اتنے زیادہ نئے اور مختلف النوع گروپ قائم کر دیے ہیں۔ تقریباً بیس غرب کسانوں کو ہجن کر انہیں عوامی فوج کا ممبر بنادیا گیا اور ایک نوجی سار جنٹ کو ان کی ٹریننگ پر مامور کر دیا گیا۔ کانپنیوں نے متعدد نوجوانوں کو دعوت دی کہ وہ جمہوری نوجوان لیگ نامی انجمن میں شامل ہو جائیں۔ لڑکیوں کو عورتوں کی انجمن میں شامل ہونے کی ترغیب دی گئی۔ آٹھ نو سال کی عمر کے بچوں تک کو بھرتی کر کے نوجوان نہم جو انجمن کا ممبر بن دیا گیا۔ شامل ہونے والوں کو اپنی گردن میں پلٹنے کے لیے سرخ رو مال دیے گئے۔ بیسے زیادہ انجمن مجھے اس بات سے ہوتی تھی کہ کمپنی نے ہی عجیب و غریب قسم کے لوگوں کو ان گروپوں کا لیڈر بنارہے تھے۔ وہ لوگ جن کے متعلق کوئی خواب و خیال میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ ان کی کوئی اہمیت ہے، اب یہاں کیک گاؤں کے لیڈر بن گئے۔ مثال کے طور پر نئی کسان انجمن کا چھیریں وونگ شیوانگ نامی ایک شخص تھا جسے چارہ کسان بھی نہیں تھا۔ کئی سال پہلے وہ ایک آوارہ گرد کی طرح اس گاؤں میں آیا تھا اور تب سے وہیں رہ رہا تھا۔ وہ دو وقت کی روٹی چھپوٹے موٹے کام کر کے

کہا تھا۔

اگر میں نجات — بہت جلد یہی نام زبان زدِ عام ہو گیا تھا — کے بعد کے ان ابتدائی ایام کے بارے میں اپنی یاد و اشتوں کو تازہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو سعی بسیار کے باوجود مجھے صرف یہی یاد آتا ہے کہ ہمارے گاؤں کا اس وقت کا ماحول ایسا تھا جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ جہاں تک ہماری روزمرہ کی زندگی کا تعلق ہے، اس میں بنطاحر کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی ہم اپنے کھیتوں میں جاتے تھے اور اپنی فصلوں اور سبزیوں کی نگہداشت کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہماری آبادی میں ہر چیز منتشر ہو کر رہ گئی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم انھیں پسند کرتے تھے یا نہیں ہم گاؤں کے پڑانے ارباب اقتدار کے عادی ہو چکے تھے مثلاً حفاظتی انجمن، قبیلوں کے بزرگ اور امیر خاندان۔ اب یکاک وہ نابود ہو گئے تھے اور ان کی جگہ اجنبی آگئے تھے۔ اس بڑی تبدیلی سے ہم میں سے بیشتر کے دل میں بے چینی اور کشیدگی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ رفتہ رفتہ مجھے اس بات سے تشویش ہونے لگی کہ ہمہ وقت میری نگرانی کی جا رہی ہے اور جب بھی میں کوئی بات کہتا ہوں تو کوئی نہ کوئی اسے سن رہا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یا کہ رہا ہوں وہ کمیونٹیوں کو ناپندر ہو۔ میں پوری طرح وضاحت نہیں کر سکتا کہ میرا مطلب کیا ہے، صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے چینی محسوس کرتا تھا اور میرا خیال ہے کہ اسی طرح دوسرے لوگ بھی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

پھر جلسوں کی بھر مار تھی۔ ہفتے میں کئی بار کسان انجمن کے جلسے ہوتے تھے۔

جلے شام کے وقت بُلاُئے جاتے تھے اور بڑے ہی بے کیف ہوتے تھے۔ بالعموم یہ ہوتا کہ کانپر ماؤنٹ نگار کے متعلق تقریر یہ شروع کر دیتا اور پھر کمیونزم کی تشریح کرنے لگتا۔ اس کی تقریر کافی لمبی ہوتی تھی اور جو کچھ وہ کہتا تھا، بالعموم میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات انہم کا صدر ہمیں کہتا کہ ہمیں آسانش کی زندگی نہیں بسر کرنی چاہیے اور روپیہ بجا کر سرکاری بونڈ خریدنے چاہیں۔ میں حیران تھا کہ وہ اس قسم کی تقریر دونوں میں اپنا زور کیوں صرف کرتا ہے جبکہ وہ جاننا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی آسانش کی زندگی بسر نہیں کر رہا تھا۔ ان جلسوں میں ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا تھا اور بالعموم ہم وہی باستیں وہرا دیتے جو کانپر کہا کرتا۔ مثال کے طور پر ہم کہتے کہ کمیونزم ہمارے لیے مسٹر کا پیامی ثابت ہو گا اور یہ کہ اب عوام آزاد ہیں۔ کئی بار مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لڑکپن کے دن واپس آگئے ہیں اور میں پھر سکول میں بیٹھا ہوا ہوں جہاں ہمیں کنفیوشن کی کالری کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ جہاں ہم ایسے انفاظ دہراتے رہتے تھے جن کا مفہوم ہمیں مطلقاً معلوم نہیں تھا۔ جلسوں کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ یہ دن بھر کی محنتِ شادو کے بعد منعقد ہوتے تھے جب میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی تھی کہ میں کھانا کھاؤں اور سو جاؤں۔ بہر حال پہلو تھی کہ کوئی گنجائش نہیں تھی۔ عدم شرکت مصیبت کا باعث بن سکتی تھی اور میں مصیبت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔

زیرنوں کے ادھر میں جبکہ نجات کو تقریباً ایک برس ہو چکا تھا، انہم کے کچھ لیڈروں اور کانپراؤں نے اس امر کا اشارہ کیا کہ عنقریب ایک نئی پالیسی پر عمل ہو گا جس کا مطلب یہ ہو گا "زمین کا شتکار کی ہے۔" ہمیں معلوم ہوا کہ کھیتوں کو گاؤں کے مختلف

کسانوں میں تقسیم کر دیا جائے گا اور جاگیردار ہونا کوئی اچھی بات نہیں تھی معلوم ہتا تھا کہ متوقع اصلاح کا علم سب سے پہلے بڑے بڑے جاگیرداروں کو ہوا ہے کیونکہ انہوں نے زمین کو اپنے غریب رشته داروں کے نام منتقل کرنے کی مشتبیہ شروع کر دیں اور بعض اپنی زمینوں کو اونے پونے فروخت کھی کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے میرے والد کو بھی زمین خریدنے کی پیش کش کی جو کافی دل کش تھی ہم نے اس پیش کش پر غور کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ ان دنوں امیر بھما جانا خطے سے خالی نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا ہمارا فیصلہ و انش مندا نہ تھا۔

اگرچہ گاؤں میں پھیلنے والی بیشتر افواہیں غلط تھیں لیکن زرعی اصلاح کی خبر سمجھی ثابت ہوئی۔ ایک شام انہم کے جلسے میں ایک کانپونے لمبی سی تقریب کی جس میں اس نے کہا کہ چین کے کروڑوں کسان اب اپنے گاؤں پر کھڑے ہو رہے ہیں۔ اس نے اس قسم کی اور بھی کئی باتیں کہیں۔ اس کے بعد انہم کے صدر نے ہمیں بتایا کہ ہماری طبقاتی درجہ بندی کی جائے گی اور طبقاتی درجہ بندی کرتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھا جائے گا کہ ہم کتنی زمین کے مالک ہیں اور ہمارا زہن ہم کا معیار کیا ہے۔ آنے والے چند ہفتوں میں ہماری درجہ بندی میں مدد دینے کے لیے کئی نئے کانپوگاؤں میں آگئے۔ انہوں نے ہم سے بے شمار سوال پوچھے۔ میرا خیال ہے کہ جن جاگیرداروں اور امیر کسانوں نے اپنی جائیدادوں کو منتقل کرنے کی کوشش کی تھی تو ان میں سے بیشتر کا پتہ چلا دیا گیا تھا، کیونکہ بیشتر غریب کسان اس سلسلے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے بہ آسانی رضامند ہو گئے۔ ویسے بھی ایک چھوٹے سے گاؤں میں، جیسا کہ ہمارا گاؤں تھا، رازداری آسان نہیں ہوتی۔ بالآخر جب

تحقیقات کا عمل مکمل ہو گیا تو انہوں نے ایک پوسٹر میں نتائج کا اعلان کر دیا۔ کاپنپوڈ  
نے ایک بہت بڑے دو منزلہ مکان پر قبضہ کر لیا جو ہاگ کانگ کانگ میں رہنے والے ایک  
بڑے جاگیر دار کی ملکیت تھا۔ اس مکان کے بالائی کمرے کی بیرونی دیوار پر کاغذ کی  
سرخ پر چیاں چپاں کر دی گئیں۔ ہر پچھی پر ایک خاندان کا نام درج تھا اور اس  
میں یہ بھی تحریر تھا کہ اس کے پاس کتنی زمین ہے۔ کسانوں کی کئی قسمیں تھیں: جاگیر دار،  
امیر کسان، غریب کسان اور کیرے۔ ہمارے خاندان کو چونگ لنگ مان قرار دیا گیا  
تھا یعنی متوسط درجے کے کسان۔ دیوار پر کل دو سو پچاس پر چیاں چپاں تھیں۔  
چھیس کے قریب خاندانوں کو جاگیر دار یا امیر کسان قرار دیا گیا تھا اور ایک سو  
پچاس کے قریب کو غریب کسان۔ باقی ہمارے گھرانے کی طرح متوسط درجے کے  
کسان تھے۔ کیرے ہمارے گاؤں میں کچھ زیادہ تھے ہی نہیں۔

ہم بتایا گیا کہ اگر ہم یہ سمجھتے ہوں کہ ہماری درجہ بندی منصفانہ نہیں ہے تو  
ہم اس کی شکایت کر سکتے ہیں اور کچھ کسانوں نے شکایت کی بھی۔ مثال کے طور پر  
ایک کسان نے کہا کہ اس کی بیشتر زمین دراصل اس کے بھائی کی ملکیت تھی جس کی  
ہاگ کانگ میں موت ہو گئی۔ وہ اپنی زمین فروخت نہ کر سکا۔ اس کے باوجود اُسے امیر  
کسان قرار دے دیا گیا۔ میرا والدیہ کہنا چاہتا تھا کہ ہماری نصف زمین میری ملکیت ہے  
لہذا وہ اور میں دراصل غریب کسان ہیں لیکن ایک دوست نے اسے بتایا کہ درجہ بندی  
گھرانے کی بنیاد پر کی گئی ہے اور چونکہ میرا باپ اور میں ایک ہی چھت کے تلے رہتے  
تھے اس لیے ہم ایک ہی گھرانے کے افراد تھے۔ بہر حال ایک کاپنپوڈ نے ہمیں قلی دی  
کہ ہمیں گھرانے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ زمین کی اصلاح کا ہر سو دراصل

جاگیردار اور امیر کسان ہیں۔ اس سے ہماری کچھ تسلی ہو گئی۔ سچ پوچھیے تو ہم جاگیرداروں کے ساتھ کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی اور ہم سمجھتے تھے کہ اگر غریب کسانوں کو ان زمینوں کا جن پر وہ کاشت کرتے ہیں، مالک بنادیا جائے تو یہ اچھی بات ہو گی۔

میں اگرچہ اس بات سے متفق تھا کہ زمین مسحی کسانوں کو دیدی جائے لیکن اس تشدد کے لیے می نظر تھا کہ تیار نہیں تھا جس کا عنقریب گاؤں کو سامنا ہونے والا تھا۔ جس تحریک کے نتیجے کے طور پر تشدد کا دور دورہ شروع ہوا اسے "حساب چکانے" کی ہم فراز دیا گیا تھا۔

اس ہم کا پہلا تجربہ، جو ۱۹۵۱ء میں موسم گرما کی فصل کے فوراً ہی بعد شروع ہو گئی جلد ہی ہو گیا۔ کسان انہم کے عابر ایک روز صبح سوریے ہٹکے گھر پہنچے اور ہمیں بتایا کہ ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں کے مرکزی مقام پر جمع ہو جائیں۔ ہم دہاں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ سبھی گاؤں والے دہاں موجود ہیں۔ تقریباً ایک ہزار لوگ تھے جو آلتی پالتی مارے بیٹھتے تھے۔ زمین کے کناروں پر بانش کے ڈنڈے نصب تھے اور ان ڈنڈوں پر جھنڈے لٹک رہے تھے جن پر اس قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے "جاگیرداروں پر ہائے خون کا قرض ہے"۔ "جا برلوں کے ساتھ حساب چکانے کا وقت آگیا"۔ ان جھنڈوں کے پیچے کئی سپاہی صفت بازدھے گھڑے تھے اور ہمارے سامنے ایک میز تھا جس کے دونوں طرف مقامی ملیشیا کے سپاہی صفت بستے تھے۔ میر پر کسان انہم کا صدر، کچھ لیدر اور چند کاپو میٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ یہ ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ کاغذات کا مطالعہ کر رہے ہوں اور باقی سرگوشیوں میں مصروف تھے جیسے کچھ اہم معاملات زیر غور ہوں۔

” یہ عوام کا ٹر بیونل ہے ” انجن کے صدر نے کئی بار چلا چلا کر کہا۔ ہم سب پر خاموشی طاری تھی۔ تب میشیا کے ایک آدمی نے ایک بوڑھے آدمی کو دھکیل کر آگئے کیا جس کے دونوں ہاتھ چھپے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سفید بال کا نوں پر لٹک رہے تھے، اس کی آنکھیں آدھی بند تھیں اور اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً ہی پہچان لیا کہ وہ ہمارے گاؤں کا جائیر دار لیونگ وانگ چی ہے۔ وہ نودار ہوا تو ہر کسی نے اپنا سانس روک لیا کیونکہ ہماری نظروں میں وہ ہمیشہ ایک باوتار شخصیت رہا تھا جو ریشمی لباس میں ملبوس ہوتا تھا۔ اب ایسا نظر آتا تھا جیسے اسے پیٹا گیا ہو یا اس کے ٹھوکریں لگائی گئی ہوں۔ شروع شروع میں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اسے اس بسلوکی کا خاص طور پر مستحق کیوں سمجھا گیا۔ یہ سچ ہے کہ وہ کسانوں کو بٹانی پر زمین دیتا تھا اور سود پر روپیہ بھی دیتا تھا لیکن لوگ نہ تو اسے ہرا آدمی سمجھتے تھے اور نہ جا برد۔

میں شاید غلطی پر تھا کیونکہ انجن کے صدر نے بوڑھے لیونگ کے جرام کی ایک طویل فہرست پیش کر دی۔ وہ ایک انقلاب دشمن تھا اور امریکیوں اور کیوں نہانگ کا ایجنسٹ تھا۔ وہ کمیر دل کو اتنی کم تباخا دیتا تھا کہ وہ لوگ عملًا اس کے غلام ہوتے تھے۔ اس نے ایک کسان کو جس کے بچے کو دوا دار دل کی ضرورت تھی، قرض دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ بچہ مرجیا تھا۔ اس نے ایک غریب لڑکی کو اس کے ماں باپ سے خرید لیا تھا اور اسے اپنی داشتہ بنالیا تھا۔ اس سے اور بھی کئی جرام منسوب کیے گئے تھے جن کی یاد اب بھرے ہانٹے میں محفوظ نہیں۔

میرا خیال تھا کہ جب صدر اپنی بات پوری کر چکے گا تو لیونگ بھی کچھ کہے گا لیکن

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس کے شانے بھی ہبھے تھے اور اس کا سر تک رہا تھا۔ ایک لمحے تک گھبراہٹ کا سا عالم طاری رہا کیونکہ کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ تب اگلی صفوں سے ایک نوجوان جو گاؤں میں کمیرے کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا، اچک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ لیونگ نے اس کے سختی کو مار دیا تھا۔ پھر ایک بوڑھی عورت نے رو دکر کہا کہ لیونگ نے اس کی بیٹی کی بے حرمتی کی تھی۔ اس الزام پر مجھے کچھ حیرت ہوئی کیونکہ غریب کسان کی باراپنی بیٹیاں فردخت کر دیتے تھے اور پہلے کوئی اسے جرم تصور نہیں کرتا تھا۔

اس مرحلے پر عورتوں کی لیگ کی ایک ممبر میدان میں آگئی اور اس نے بتایا کہ وہ ذاتی طور پر جانتی ہے کہ لیونگ ایک امریکی ایجنسٹ تھا۔ اس نے کہا کہ لیونگ اپنے والر لیس سیٹ پر امریکی نشریے سنائتا تھا۔ اس نے اپنی بات مشکل پوری کی تھی جب کسی نے چلا کر کہا "اے مارو" اور ایک اور شخص چلا کر "اے ننگا کرو۔ اے قتل کر دو" تب ایک نوجوان نے جسے اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا بوڑھے لیونگ کے منہ پر آگے بڑھ کر گھر نسہ جا دیا اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔

میری بیوی نے یہ منظر دیکھ کر اپنا منہ بھر لیا۔ کچھ بچوں نے رونا شروع کر دیا اور میں نے دیکھا کہ کچھ مائیں اپنے بچوں کو وہاں سے لے جا رہی ہیں۔ لیکن سپاہیوں نے ان کا راستہ روک لیا اور انھیں وہیں رہنا پڑا۔ بہرحال کچھ لوگ ایسے کبھی تھے جو اس بے رحمی کو زیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ "بابر جا گیر دار کو فیل کر دو" انہیں کا صدر اٹھ کر تالیاں بجانے لگا۔ رفتہ رفتہ دوسرے بوگ کبھی اسی کی طرح تالیاں بجانے لگے۔ میں نے بھی تالیاں بجا میں اگرچہ میں بُری طرح ڈرا ہوا تھا۔ ہم سب کافی دیر تک

تالیاں بجاتے رہے۔ تب صدر نے ایک بار پھر تقریر شروع کی۔ اس نے کہا۔ "کسان ساتھیو! ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جاگیر دار طبقہ رجت پسند کیوں مٹانگ اور امر کی سامراجیوں سے مل کر عوام پر کس طرح جبر کرتا تھا۔ ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ لیونگ و انگ چی مجرم ہے اور ہم اسے موت کی سزا دیتے ہیں۔ کیا تم اس سے متفق ہو؟"

ہم سب نے ایک بار پھر تالیاں بجائیں اور ملیشیا کے چار آدمی لیونگ کو کھینچ کر لے گئے۔ بعد میں اسے پھاٹ پر لے جا کر گولی مار دی گئی۔

گاؤں کے بیشتر آدمی یہ نہیں جانتے تھے کہ لیونگ کے قتل کی طرف کیا روانی اختیار کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے پر زور آواز میں کہا کہ لیونگ نے بہت سے جنم کیے تھے اور وہ موت کا مستحق تھا۔ کئی دوسروں نے کہا کہ سزا بہت سخت تھی۔ بوڑھے لوگ جن میں میرا باپ ہبی شامل تھا، اس بات پر کافی مضطرب تھے کہ لیونگ کے خاندان کو اس کی مناسبت بچھیز و تکفین کی اجازت نہیں دی گئی اور اس بیجا پرے کو تابوت بھی میرا نہیں آیا۔ ایک کانپوںے کسی شخص کو یہ کہتے سن لیا کہ لیونگ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس نے فوراً ہسی دریافت کیا۔ "کیا تم جا بہ جاگیر داروں کے دوست ہو؟" اس کے بعد کسی شخص نے مقدمے کے متعلق بات چیت نہیں کی۔

پھر بہت جلد ہم جاگیر داروں کے مقدمات کے عادی ہو گئے اور بے رحمی اور خون آشامی نے بھی ہم کسی نہ کسی طرح خوگر ہو گئے۔ آنے والے ہمینوں میں کئی مقدمے ہوئے۔ کئی بار ہمیں اس قسم کے مقدمے دیکھنے کے لیے آس پاس کے دیہات میں لے جایا گیا۔ ہم سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ ہم چلا چلا کر اس جاگیر دار کی موت کا مطالبہ کریں۔

جس کا سامنے پہلے کبھی نام بھی نہیں سناتا۔ کئی بار جب ہم کسی شخص کو قتل ہوتے دیکھنے کے لیے ملیٹیا کے آدمیوں کے تیچھے پیچھے جا رہے ہوتے تو بچوں کو ڈھول اور گھر طیار دے دیے جاتے اور ان سے کہا جاتا کہ وہ انھیں بجا تے ہوئے چلیں۔ گولی مارے جانے کے بعد ہم سے کہا جاتا کہ ہم لاش یہ تھوکیں۔ کئی بار ہمارے ہاتھوں میں بانس بھی تھما دیے جاتے اور ہمیں حکم دیا جاتا کہ ہم گھٹنؤں کے بل جھکے ہوئے جا گیردار کو ہٹیں۔ ہم میں سے کئی لوگوں کو اس کام سے نفرت تھی لیکن کانپو ہم پر کڑی نظر رکھتے تھے اور ہمارے لیے پہلو تھی کی کوئی تکنیکاں نہیں تھیں۔

ممکن ہے کہ اگر میں ایک بہت غریب کان ہوتا اور قرض میں بڑی طرح جگڑا ہوا ہوتا تو مجھے جا گیرداروں سے نفرت ہوتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس تعزیب اور قیال پر خوش ہوتا۔ اس وقت میرے لیے اس قسم کی کوئی بات کہنا ممکن نہیں۔ جہاں یہ واقعہ ہے کہ اس وقت ان تمام باتوں نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ الی کوئی ذاتی وجہ موجود نہیں تھی کہ میں ضلع کے ہر جا گیردار سے ناراض ہوتا۔ میرا خاندان اس قابل تھا کہ ہم جا گیرداروں سے دور رہ سکیں اور ہم ہمیشہ ان کے چنگل سے بچے رہے۔ میں اس بنا پر بھی مشوش تھا کہ کانپو بھی جا گیرداروں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ معلوم نہیں کرتے کہ کوئی جا گیردار اچھا ہے یا بُرا؟

یہ بات بڑی عجیب تھی کہ کیونکہ بعض معاملوں میں منصفانہ روایہ اختیار کرتے تھے اور بعض میں انتہائی غیر منصفانہ۔ جا گیرداروں سے اتنی بے رحمی برداشت کے بعد جب وہ زمین کی تقسیم شروع کرتے تو یہ کام کافی ایمانداری سے کرتے۔ کان انہن جا گیردار کی تمام متاع اور جامد اور بخال لیتی اور اسے غریب کانوں میں ان کے

افراد خاندان کی تعداد کے مطابق تقسیم کر دیتی۔ اگرچہ اس اصلاح کا ہم پر اثر نہیں پڑتا تھا اور خوش قسمتی سے ہماری زمین ہمارے پاس ہی رہی لیکن میرا خیال ہے کہ تقسیم کا کام خوش اسلوبی ہی سے ہوا۔ صرف یہی نہیں کہ شخص کو تقسیم میں مناسب حصہ ملا بلکہ تقسیم کرتے وقت زمین کی نوعیت کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ اس طرح ایک غریب کسان خاندان کو چار یا پانچ الگ الگ کمیت مل جاتے جن میں سے کچھ کمیت دوسرے کھیتوں سے زیادہ زرخیز ہوتے۔ یہ بات البلۃ صحیح ہے کہ کسان انجمن کے لیڈروں نے اپنے لیے بہترین زمین منتخب کر لی لیکن یہ ایسی بات تھی جس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

کیونٹوں نے وعدہ کیا تھا کہ زرعی اصلاح کے بعد شخص کی زندگی پہلے سے زیادہ خوشگوار ہو جائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بہت سے امیر اور طبقہ متوسط کے کسان جن کی زمین چین گئی تھی بدلتے ہو گئے۔ اب وہ پہلے کی طرح کڑا می مخت نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک غریب کسانوں کا تعلق ہے وہ شروع شروع میں بہت خوش تھے کیونکہ وداب اپنی زمین کے آپ مالک تھے اور انھیں اپنی فصل کا کچھ حصہ ہے طور بٹائی جا گی رہا کوئی نہیں دینا پڑتا تھا۔

لیکن کچھ مدت بعد غریب کسانوں نے بھی پیسہ و تاب کھانا شروع کر دیا اور اس کے کئی اسباب تھے۔ اول تو ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے اور پرانے دنوں کی طرح ان کی ادائیگی سے پہلو تھی اب مکن نہیں تھی۔ سیکسروں میں ایک تو زمین ٹیکس تھا، دوسرا مقامی ملیشیا کے لیے ٹیکس اور تیریا نکنگ کے سکول کے لیے ٹیکس۔ منڈی میں خرید و فروخت پر بھی ٹیکس عائد تھے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کسان اپنا سور فروخت کرتا

تو اسے بھی اور خریدنے والے کو بھی کسان ان جن کو سیکس ادا کرنے پڑتا۔ ان ٹیکسون کے علاوہ چندے بھی دینے پڑتے تھے جن سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا تھا۔ ہمیں سرکاری بونڈ بھی خریدنے پڑتے تھے اور کوئی ایک جنگ میں ہم نے اس ہم کے لیے بھی چندہ دیا جس کا نام "مراجمت امریکیہ اور حمایت کو ریا" تھا۔ بیشتر اوقات ہم ادائیگیاں دھان کی شکل میں کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ہمیں نقدی بھی ادا کرنی پڑ جاتی تھی۔

زرعی اصلاحات کے بعد ایک اور مسئلہ بھی شخص کی پریشانی کا باعث ہن گیا۔ کھاد، سبزی کے بیجوں یا آلات کا شت کے لیے روپیہ ادھار لینا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔ موسم بہار میں انماج کی خریداری کے لیے بھی روپیے کی ضرورت پڑ جاتی تھی کیونکہ کچھلی فصل سے ہم نے جو چاول بجا یا ہوتا تھا اسے ہم کھا چکے ہوتے تھے اور موسم گرم کی فصل میں ابھی دیر ہوتی تھی۔ اس دور میں بالعموم ہم قرض لیا کرتے تھے لیکن کیونٹوں نے گاؤں کے روپیہ ادھار دینے والوں کو گرفتار کر لیا اور یانکنگ کی وہ دکان بھی بند کر دی جہاں چیزوں رہن رکھنی جا سکتی تھیں۔ رشتہ دار تک ایک دوسرے کو ادھار دینے سے ہچکھاتے تھے، مبادا ان پرسو خود کی کالیزام لگ جائے۔ میرے والد ہانگ کانگ کے کچھ ڈالر ایک مکبس میں رکھ چھوڑے تھے جسے وہ اپنے بستر میں چھپا کر رکھتا تھا لیکن ان ڈالروں کو خرچ کرنے سے وہ ڈرتا تھا۔ غیر ملکی روپیہ رکھنا جرم تھا اور ہم پکڑے جانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے لہذا موسم بہار کے مشکل ایام میں ہم نے اپناراشن کم کر لیا اور صرف چند مٹھی چاول یا میہ پر آرائنا کرنے لگے۔

نجات کے ان ابتدائی برسوں میں ہمارے گاؤں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ہم کام پہلے ہی کی طرح کرتے رہے لیکن کسی نہ کسی طرح یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب ماحول مختلف ہے۔ ہمیں چونکہ اپنا فالتو چاول اور سبزیاں سرکاری نرخ پر کسان انجمن کے پاس فروخت کرنا پڑتی تھیں اس لیے ہم پہلے کی طرح منڈی کے دن اب یانکنگ شاڑوں اور ہی جاتے تھے۔ اور چند بار جب ہم منڈی گئے بھی تو ہمیں مایوسی ہوئی۔ پہلے جیسی گہاٹکی رخصت ہو چکی تھی۔ ہاکروں کے پاس اب بیچنے کے لیے کچھ زیادہ چیزوں میں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ صرف روزمرہ کی ضروری چیزوں میں مثلاً دانت برش یا صابون ہی بیچتے تھے اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح اپنی چیزوں کی تعریف میں چرب زبانی بھی نہیں دکھاتے۔ بہت سے چائے خانے اور سبزیوں کی دکانیں جہاں بیٹھ کر لوگ گپ بازی کیا کرتے تھے، اب بند ہو گئیں تھیں گاہک ہی نہیں رہے تھے۔ لذیذ کھانوں پر روپیہ صرف کرنا اب بُرا سمجھا جاتا تھا اور یہ بات بھی بد اطواری کے متراود بن گئی تھی کہ دو پھر کے وقت کام کرنے کی بجائے کوئی شخص تفریح یا گپ شپ میں مصروف ہو جائے۔

پرانے تھوار اور تقریباً بھی رفتہ ہمارے گاؤں میں ختم ہوئی گئیں۔ قبائلی تنظیمیں ختم کر دی گئیں اور بزرگوں کی پرستش کے جوہاں تھے وہاں کیونسوں کے جلے ہونے لگے۔ ایسی کوئی جگہ بھی نہیں رہی تھی جہاں بڑے بڑے ماہی جلے ہوتے یا شادی کی دعویٰ میں ہوتیں۔ پھر اس قسم کی باتوں کے لیے کسی کے پاس پیسہ بھی کہاں تھا (اور اگر کسی کے پاس ہوتا بھی تو کوئی اسے ظاہر کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کیونسوں نے اہم اہم روایتی تقاریب میں

کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ نوروز یا جشنِ مہتابی بہت بڑے پیمانے پر مناتے تھے۔ ان موقعوں پر وہ بڑی بڑی پریڈوں کا انتظام کرتے جن میں گھر میال بجائے جاتے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یا نگوناچھ ناچتیں اور قایا بازیوں کے کھیل بھی ہوتے۔ نجات سے پہلے کی طرح اب لوگ چھپٹی کا دن اپنے گھر والوں کے ساتھ گھر پر نہیں مناتے تھے۔ کانپو یہ چاہتے تھے کہ ہم سب مل کر ہی تقریباً میں کیونکہ ان کے نزدیک یہ بھی سو شلزم کا حصہ تھا۔

ہمیں ڈرامے اور اوس پر ابھی دکھائے جاتے تھے جن کے بیشتر موضوعات وطن دوستی پر مبنی ہوتے تھے۔ بزرگوں کے ایک پرستش گھر کو سینما میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بیشتر کسانوں کے ساتھ ہم بھی ہاں میں بیٹھ گئے جہاں کافی ہجوم تھا۔ پہلے میں نے کبھی سینما نہیں دیکھی تھی اور شروع شروع میں مجھے سینما دیکھنے میں بہت لطف آیا۔ لیکن جلدی ہی مجھے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ بیشتر فلمیں بندوں کی تعمیر، خطرناک کیرڑوں مکوڑوں کی ہلاکت اور جہانی ورزش کے متعلق تھیں میں نے سینما جانا چھوڑ دیا بشرطیکہ کوئی اچھی فلم نہ دکھائی جا رہی ہوتی۔ مثلاً پرانے شہنشاہوں کے متعلق کوئی فلم۔ کبھی کبھی جب عوامی نجات دہنده فوج یا پیکنگ کے کسی اہم واقعے مثلاً نجات چین کی سالگرد پر کوئی فلم دکھائی جا رہی ہوتی تو ہم سب کو وہاں جانا پڑتا۔

**لیکوئٹ** نہ بندے ہمارے گاؤں میں کھیلوں کو بڑھا دادیتے۔ تھے

اور یہ بات بچوں کو راغب کرتی تھی۔ فٹ بال کی نیمیں بنائی گئیں اور کھلیان کے ایک کنارے پر باسکٹ بال کے جال بھی لگائے گئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میرے والد نے یہ ناٹھا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو اکٹھا کھیلنے کی اجازت ہے تو اس نے بے نقینی سے اپنا سر بلاؤ دیا تھا۔ بزرگوں کی پرستش کے ایک بال کو مدرسے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کانپوکسانوں پر زور دیتے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیجیں۔ انہوں نے شام کو ان بالغوں کے لیے بھی کلاسیں جاری کر دی تھیں جو لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہتے تھے۔

کھیلوں اور پریڈوں سے ہمارے گاؤں کے بچوں کو خوش کرنے کی کمپنیت خاص کوشش کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ بچے اس قسم کی باتوں کو پسند کرتے تھے لیکن کچھ والدین کو یہ تشویش ضرور تھی کہ ان کے لڑکے اور لڑکیاں اس طرح پروردش پا کر اپنے خاندانوں کی کچھ زیادہ عزت نہیں کریں گے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی طرح میری اپنی بہن بھی جس کی عمر اس وقت پندرہ یا سولہ برس تھی، کیونٹوں کی باتوں سے متاثر ہو گئی تھی۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی عورتوں کی لیگ کے جلسوں میں جایا کرتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو لیکھراں نے وہاں سنے والے اسے بہت پسند آئے۔ ایک دن جب ہم کھیلوں میں آرام کر رہے تھے تو اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح کیونٹ گزشتہ تیس برس سے عورتوں کی نجات کے لیے کوشش رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ”اب وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے ماں باپ، ہمارے خاوند یا کیومنڈانگ کے غنڈے ہم پر جبر نہیں کر سکتے۔ اب ہم آزاد ہیں، جس کے ساتھ

چاہیں شادی کر لیں۔“

میں نے پوچھا کہ ”کیا تم والد کی مخالفت کرو گی؟“

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور میرا خیال ہے کہ وہ تذبذب میں پڑ گئی تھی۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد جب اس نے شادی کی تو اس کا دو طہا میری بیوی کا چھپرا بھائی تھا اور شادی رسمی انداز میں طے پائی تھی لیکن میری بہن بپسند تھی کہ اس نے خاوند کا انتخاب آزادا نہ ہی کیا ہے کیونکہ اگر وہ چاہتی تو اسے مسترد کر سکتی تھی۔ میں نے اس سے بحث نہیں کی لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا ذہن صاف نہیں تھا۔ مجھے سلیم ہے کہ اس وقت کئی باتوں کے متعلق میرا اپنا ذہن بھی صاف نہیں تھا اس لیے میں اپنی بہن کے رویتے پر کوئی کڑی نکلتے ہی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم کا نوں کو سب سے زیادہ گھبراہٹ اس بات سے ہوتی تھی کہ یونیٹ ہمارے کاموں میں مداخلت کرنے لگے تھے۔ جب زرعی اصلاحات کے دوران میں کھیتوں کو تقسیم کر دیا گیا تو ہم یہ سمجھتے تھے کہ اب ہم پہلے ہی کی طرح اپنی فصلیں اگاتے رہیں گے لیکن ۱۹۵۴ء کے موسم گرما میں جب ہم چاول کی دوسری فصل بور ہے تھے تو کسان انجمن نے ہمیں ایک نیا اعلان سننے کو ایک جلسے میں بانا�ا۔ ایک کانپونے تقریب کرتے ہوئے کہا کہ کسان ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو آلات کاشت ادھار دیتے رہے ہیں اور فصل کی کٹائی میں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم سب اس سےاتفاق کریں گے کہ اس طرح پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر دو تین

نہ انوں کے آپس میں مل کر کام کرنے سے فصل بہتر ہو سکتی ہے تو کوئی دجھے نہیں کہ اگر دس پندرہ خاندان آپس میں تعاون کریں تو فصل اور بھی اچھی نہ ہو۔ بات جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "زمین تھا میری ہی ملکیت رہے گی لیکن اس پر اکیلے کام کرنے کی بجائے سبھی تھاری مدد کریں گے۔ بھلا اتنے اچھے انتظام کی کوئی کیسے مخالفت کر سکتا ہے؟"

آنندہ چند ہفتوں میں کئی نئے کانپوگاؤں میں آگئے اور ہمیں اپنی تنظیم کرنے میں مدد دینے لگے۔ نئی تنظیم کو انہوں نے امداد باہمی کی ٹولیوں کا نام دیا تھا۔ شروع شروع میں انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ کسان اس معا۔ ملے میں آزاد ہیں کہ وہ امداد باہمی کی ان ٹولیوں میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ ایک شام میں نے اور میرے باپ نے نئی ٹولیوں کے قیام پر تبادلہ خیال کیا میری دوسری بہن کی شادی ہو چکی تھی اور میری ماں بڑھی ہو رہی تھی اس لیے اب کھیت میں ہم دونوں کے علاوہ میری بیوی ہی کام کر سکتی تھی۔ یہ بات کافی خوش آئند نظر آتی تھی کہ اب دوسرے لوگ بھی کام میں ہمارا ماتھ بٹائیں گے۔ دوسری طرف یہ بھی تھا کہ ہم نے اس سے پہلے اتنے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کبھی نہیں کیا تھا۔ ہم جiran تھے کہ اگر ٹولی کے کچھ ممبر کا ہل ہوئے تو کیا ہوگا اور یہ کون بتائے گا کہ ٹولی کے کس ممبر کو کیا کام کرنا چاہیے؟ آخر ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہم نے نیصلہ کیا کہ ہم ایک ٹولی میں شامل ہو جائیں اور اگر وہاں کا ماحول ہمیں پسند نہ آئے تو بعد میں اسے چھوڑ دیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہمیں یہ احساس نہیں تھا کہ اس معاملے میں ہم اتنے آزاد ہرگز نہیں تھے

جتنا ہم نے سمجھ رکھا تھا۔

امدادِ باہمی کی ٹیم میں شرکت کے سلسلے میں بیشتر کسان ہم سے کہیں زیادہ سمجھ کچا رہے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان میں سے اکثر یہ دلیل دیتے تھے کہ جب دس یا پندرہ کسان مل کر کام کریں گے تو وہ ایک دوسرے کے کام میں روکاوت ڈالیں گے اور آپس میں جھگڑے نہ لگیں گے۔ باقی کسان یہ کہتے تھے کہ وہ تنہا ہی کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اب جب وہ اپنی زمینوں کے مالک ہیں، جو چاہیں سو کریں۔ کانپو کافی دن تک ان کسانوں سے بات چیت کرتے رہے اور آخر ان کی رائے بد لئے میں کامیاب ہو گئے۔ جب چند کسان انکار پر بضدر رہے تو کانپونارا ضم ہو گئے اور کہنے لگے جو کسان اپنے پڑوسی کی مدد نہیں کرتا وہ ایک جابر جاگیر دار سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے ساتھ ہی کسان انجمن نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ صرف امدادِ باہمی کی ٹولیوں کے ممبروں کو ہی یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی پیداوار فرداخت کر سکیں اور دوسری کوئی امداد حاصل کر سکیں۔ چونکہ کوئی کسان، کسان انجمن کی مخالفت مولے کر جی، ہی نہیں سکتا تھا اس لیے بالآخر ضدی کسان بھی ان ٹولیوں میں شرکیت ہونے پر مجبور رہے گئے۔

ہم جس ٹولی میں شامل ہوئے وہ دس خاندانوں پر مشتمل تھی، تقریباً چالیس افراد۔ زمین مجموعی طور پر پچاس ماڈ تھی یعنی آٹھہ ایکڑ سے کچھ زیادہ۔ ہم سب بڑوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ جب ہم پہلی بار ایک آبائی اہل میں جمع ہوئے

تو میں یہی سمجھتا تھا کہ ہم آسانی سے اس بات پر تفقت ہو جائیں گے کہ کام کی ابتداء کہاں سے ہونی چاہیے اور اس کے بعد فوراً ہی کام شروع ہو جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم کچھ کرتے ایک کانپو کے لیے تقریر کرنا ضروری تھا۔ اس نے ابتداء یہاں سے کی کہ ہمیں کڑا می محنت کرنا چاہیے۔ تب میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ہمیں کتنا چاول پیدا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے اس نے نشانے کی اصطلاح استعمال کی۔ اس نے کہا کہ ریاست کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اس نشانے سے بھی زیادہ چاول پیدا کریں تاکہ چین کو سو شلزم کی لڑائی میں فتح حاصل ہو۔ اس سے پہلے ہم سے یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا گیا تھا کہ ہمیں آنا چاول آگانا چاہیے۔

کہاوت ہے کہ اگر راج مردود ضرورت سے زیادہ ہوں تو مکان بے ڈھنگ کی بنتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابتداء کار سے ہی ہماری ٹولی میں گڑ بڑ شروع ہو گئی تھی۔ ہم ایک خاندان کے کھیت سے دوسرے خاندان کے کھیت میں جاتے، کیا ریاں بناتے، پانی دیتے اور دھان بوتے۔ لیکن جلد ہی کچھ کسانوں کو شکایات پیدا ہونے لگیں۔ ایک کسان نے جس کا نام دونگ شیہہ لو تھا ٹولی کو اپنا بیل بھی دے رکھا تھا لیکن جیسے ہی اس کے کھیت میں ہل چلا یا جا چکا، اس نے کہا کہ اس کا جانور بہت تھک گیا ہے، اب اسے آرام ملنا چاہیے۔ اس پر ہم میں سے کوئی نے اعمیت راض کیا اور زیچ کھیت بھگڑا شروع ہو گیا۔ کسی نے کہا "ابھی بہت زمین میں ہل چلانا باتی ہے" اور دونگ نے ترکی بہتر کی جواب دیا "ایک مرابیل تو کسی کے کھیت میں بھی ہل نہیں چلا سکے گا؟" آخر ایک

کان کا نپو کو بلا لایا اور اس نے وونگ کو اس پر آمادہ کر دیا کہ بیل سے کام لیا جاتا رہے۔ جب ہم دوبارہ کام پر لگے تو کسی نے وونگ سے کہا کہ اگر اس کا بیل مر گیا تو ہم سب گلچھرے اڑائیں گے، خوب پریٹ بھر کر گوشت ملے گا۔

دوسری ٹولیوں کے مبردوں نے شکوہ کیا کہ ان کے ہلوں اور بیلچوں سے آنا کام لیا جا رہا ہے کہ وہ بالکل بیکار ہو جائیں گے اور جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے بعض کسان جہاں اپنی زمین پر جی توڑ کر محنت کرتے تھے وہاں دوسرے کے کھیتوں میں وہ بالکل ہی کامل ہو جاتے تھے۔ بہر حال مجھے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان تمام کوتا ہیوں کے باوجود ہم نے ساری زمینوں پر بوانی کا کام اس مدت سے کچھ کم ہی مدت میں پورا کر لیا جو عام طور پر بوانی میں لگ جاتی تھی لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے کچھ فائدہ بھی ہوا۔ ہماری ٹولی کے کسان ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے۔ ہم اپنے پڑو سیدوں کی ایک ٹولی کی بجائے جھگڑا لو ٹوں بن گئے۔

اس کے علاوہ کانپو بھی ہمیں ایڑ لگانے لگے اور مجھے اس میں بڑا ہی شک ہے کہ اس سے کچھ فائدہ ہوا۔ انہوں نے ایک نئی تحریک کا آغاز کیا جسے وہ مقابلے کی ہم ترا رہ دیتے تھے۔ وہ ایک ٹولی کو دوسری ٹولی سے یہ کہہ کر سہڑا دیتے کہ دھیں کون سی ٹولی زیادہ ہل چلاتی ہے اور زیادہ جلدی بوانی کرتی ہے۔ وہ ایسے کسانوں کو بھی منتخب کرنے لگے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ زیادہ سخت محنت کرتے ہیں۔ جلسوں میں ان کی تعریف کی جاتی اور انھیں سورما کا خطاب دیا جاتا کانپو دوسروں سے کہتے کہ وہ ان کی مثال کی پیروی کریں۔ ہماری زندگی اور

بھاگم بھاگ میں گزرنے لگیں۔ ہمارا سارا وقت امداد باہمی کی ٹولیوں ہی میں گزرنے لگا۔ ہمیں چاول اور سبزیاں بننے سے فرصت ملتی تو کانپوہیں دوسرے کاموں میں مصروف کر دیتے۔ ہم سے پشتون کی مرمت کرائی جاتی۔ پانی کو محفوظ رکھنے کو تالاب کھدوائے جاتے اور آس پاس کی ندیوں کے کنارے بندہ باندھنے کو کہا جاتا اور ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ جلسوں کی بھرما رہی تھی۔ کسی جلسے میں جلدی جلدی بوائی کرنے کی اہمیت پر زور دیا جاتا کسی میں ہمیں کھاد اکٹھا کرنے کو بتھ بندہ کیا جاتا اور کسی میں ہم سے کہا جاتا کہ ہم چاول کے کیرڈوں سے ہوتی شایر رہیں۔ پرانے زمانے میں پتیل کے گھڑیاں تسبیحی بجائے جاتے تھے اگر گاؤں میں آگ لگی ہو یا کسی اور ہنگامی صورت حال کا سامنا ہو لیکن اب جلسوں کا اعلان کرنے کے لیے ہر روز گھڑیاں بجائے جاتے تھے۔ کبھی کام کرنے والوں کی ٹولیاں اکٹھی کرنے کے لیے گھڑیاں بجائے جاتے اور کبھی صرف اس مقصد کے لیے ہمیں گھردوں سے نکال بیا جاتا کہ ہم نئے نئے سُن سکیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں ہر وقت ہنگامی صورت حال کا سامنا ہے۔

ویسے کبھی کبھی ہمیں نازک صورت حال کا واقعی سامنا ہو جاتا تھا۔ ۱۹۵۵ء کے اوائل میں موسم بہار کی چاول کی نصل بونے کے لیے ہم ہفتہ تک باش کا انتظار کرتے رہے اور لے دے کر صرف ایک دو بار پھوار پڑی۔ کانپو اس تعریف کے حقدار ہیں کہ انہوں نے پانی محفوظ رکھنے کے لیے تالاب کھدوائیے تھے جن کی بدولت ہمیں تھوڑا بہت پانی مل گیا۔ بہر حال پانی میدان کے

نام کھیتوں کی آبیاری کے لیے بھی کافی نہیں تھا اور پھر جو کھیتیاں تھیں ان کے لیے تو پانی بالکل نہیں تھا۔ ایسی خشک سال میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ صوبے کے دوسرے حصوں میں صورت حال اس سے بھی خراب تھی، جہاں لوگوں کو پینے تک کے لیے پانی نہیں ملتا تھا۔

اس وقت ہی یا غالباً اس سے کچھ دیر بعد کمپنیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ امداد باہمی کی ٹولیاں اتنی مستعد نہیں تھیں کہ وہ فصلوں میں اضافہ کر سکتیں۔ جب ہم نے یہ بات پہلی بار سنی تو کئی نے یہ سوچا کہ اب ان ٹولیوں کو منتشر کر دیا جائے گا۔ میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ اب ہم پہلے کی طرح از سرخ اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرنے لگیں گے۔ لیکن کانپوؤں کی تنقیص سے جو نتیجہ میں نے اخذ کیا تھا وہ بالکل غلط تھا۔ اس بات کی بجائے کہ ہمیں پرانے دور کی طرح اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرنے کی اجازت دی جاتی اب ہم سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ہم دسیع تر ٹولیوں میں شامل ہو جائیں جنھیں کو آپریلو اداروں کا نام دیا گیا تھا۔

یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی لیکن یہ تبدیلی ہمارے گاؤں میں راتوں رات ہی ظہور پذیر نہیں ہوئی جب طرح امداد باہمی کی ٹولیوں کے قیام کے وقت ہوا تھا، اسی طرح اس طرح مرتبہ بھی کمپنیوں نے لیکھر بازی میں بہت سا وقت صرف کیا اور وہ کسانوں کو اس کا قابل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ نہ کو آپریلو

اداروں میں شرکت ان کے لیے مفید ہوگی۔ میں نے چونکہ ساری تقریروں کو توجہ سے کبھی نہیں نہ اس لیے مجھے وہ سب کچھ یاد نہیں جو کانپو اور کسان انجمن کے پیڈر کسانوں سے کہا کرتے تھے۔ بہر حال اتنا مجھے یاد ہے کہ وہ کسانوں کو اس بات کا قابل کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ جب کام کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی تو پیداوار بڑھے گی، فصلوں میں انسافہ ہو گا اور نتیجہ سب ہی امیر تر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اس نئے نظام کے تحت وہ ایک بھی وقت میں مختلف کام کر سکیں گے۔ جہاں ایک گرد پہل چلانے میں مصروف ہو گا، وہاں دوسرا کھاد اکٹھی کرنے میں اور تیسرا پشتوں کی مرمت یا مویشیوں کی دیکھ بھال میں۔ کانپو کہتے تھے کہ یہ نظام کا رصرف زیادہ اچھا اور موثر ہی نہیں بلکہ زیادہ نسبت ناجی ہے کیونکہ ہر کسان کو اس استبار سے معاوضہ ملے گا کہ اس نے کتنا کام کیا ہے اور کتنی کڑی محنت کی ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم سب یہ بات جاننے کے بہت مشتاق تھے کہ نئے کو آپ میوں نظام میں ہماری زمینوں کا کیا حشر ہو گا؟ اس سلسلے میں جو بات چیت ہوئی وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک میٹنگ میں ایک کانپو ہم میں کسانوں سے بات چیت کر رہا تھا۔ جسپرہ ایک کسان نے یہ پوچھا کہ ہماری جامداؤ کا کیا بنے گا؟ تو کانپو نے جواب دیا۔ ”ہر کسان ترکاری کا بانغ لگانے کو ایک چھوٹا سا قطعہ زمین کا رکھ سکتا ہے لیکن بالآخر شخص کا کھیت کو آپ میوں میں مدغم ہو جائے گا۔“ اس جواب نے ہم سب کو مضطرب کر دیا اور ہم سب ایک ساتھ بولنے

لگے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ ہر شخص کے صحیح انعام کیا تھے لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ ہم سب نے زمین سے محرومی کے خلاف پُر زور استجایج کیا تھا۔

کانپو مسلسل کہے جا رہا تھا "لیکن تم اپنی زمین سے محروم نہیں ہو رہے معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اب تمہارے پاس پہلے سے زیادہ ہو گا۔ اس کی بجائے کہ ہرگھرانے کے پاس چند ایک چھوٹے چھوٹے کھیت ہوں، اب ہر شخص ایک بڑے فارم کا جزو آماک بن جائے گا۔ اب اس کی بجائے کہ صرف چند کسانوں کے پاس بیل ہوں، اب ہر کسان کے پاس بیل ہوں گے۔ ہر شخص با غیچوں، مجھلی کے جو ہڑاوں اور آلات کاشت کا ماک ہو گا اور جب ہمارے پاس بڑی بڑی نشینیں اور بڑی کھڑ آجائیں گے تو وہ بھی ہم سب کی ملکیت ہوں گے۔ یہی چیز ہے جسے ہم مشترکہ ملکیت یا عوام کی ملکیت کہتے ہیں۔ اس سے بہتر نظام دنیا بھر میں موجود نہیں" ।

ابتدائی برسوں کی تبدیلیوں نے ہم سب میں سے کوئی کو گھبراہٹ اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب تو گاؤں کے سبھی کسان تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ مشترکہ ملکیت اور اس قسم کی دوسری دل فریب اصطلاحوں کا مطلب کیا ہے لیکن اتنا ہم سمجھ گئے تھے کہ زمین ہمارے ہاتھوں سے نکل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ تخلیف غریب کсанوں کو تھی جنہیں چند ہی برس پہلے زمین ملی تھی لیکن خوش کوئی نہیں تھا۔

کیونسوں کے کوآ پر پیرو قائم کرنے کے نیچے کے بعد گاؤں میں جو کچھ

ہوا وہ سب بیان کرنا میرے یہے ممکن نہیں۔ پہلے کا نپوؤں نے امداد باہمی کی کئی ٹولیوں کا مشترک جلسہ بلا یا اور ہمیں اطلاع دی کہ اب ہم ایک چھوٹا سا کو آپریٹو ہیں۔ مجھے اور میرے باب کو کسانِ انجمن کے دفتر میں جانا پڑا تھا جہاں ہمیں ایک کاغذ پر دستخط کرنے پڑتے تھے جس میں درج تھا کہ ہم اپنی زمین نئے کو آپریٹو میں شامل کر رہے ہیں۔ بالآخر گاؤں کے چھوٹے چھوٹے کو آپریٹوں کو ملا کر جن کی تعداد پانچ تھی ایک بڑا کو آپریٹو بنایا گیا جسے کا نپو پاکستان کا نوں کا کو آپریٹو کہتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر پورے گاؤں کو جو دو سو پچاس گھر انوں پر مشتمل تھا ایک بڑے کارخانہ کا شت میں تبدیل کر دیا گیا۔ چوتی کی کمیٹی کسانِ انجمن کے کچھ لیدروں اور کا نپوؤں پر مشتمل تھی اور کو آپریٹو کو ہر قسم کی ہائیس یہی کمیٹی دیتی تھی۔ ہم سب کو کام کی صلاحیت کی بنیاد پر مختلف درجوں میں بانت دیا گیا تھا۔ درجوں کا فیصلہ کام کے نمبروں کی تعداد کے مطابق کیا گیا تھا۔ کام کے زیادہ نمبروں کا مطابق تھا چاول اور نقدی کی صورت میں بہتر تنخواہ۔ میں چونکہ نوجوان تھا اور کڑا سی محنت کر سکتا تھا اس لیے مجھے پہلا درجہ ملا۔ میرا باب جو بورڈھا ہو رہا تھا اور جس کے قوئی اب کچھ زیادہ مضبوط نہیں رہے تھے، اسے میرے درجے میں رکھا گیا۔ کو آپریٹو کی انچارج کمیٹی نے اپنا ہیڈ گوارڈ ایک بہت بڑے مکان میں قائم کیا جسے ایک بڑے جاگیردار سے چھینا گیا تھا۔ مکان کے سامنے ایک بہت بڑا بورڈ آدیزائی تھا جس پر بانس کی متعدد کھپچیاں لٹک رہی تھیں، ہر کھپچی پر ایک کسان کا نام لکھا ہوا تھا۔ جس کسان کو

جو کام کرنا ہوتا وہاں اس کے نام کی کچھی لٹکادی جاتی۔ ہر صبح ہمیں یہ بورڈ دیکھنے جانا پڑتا تھا تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ دن میں ہمیں کیا کام کرنا ہے جسے بالعموم ان ٹولیوں میں کام کرنا ہوتا جو کھیستوں میں ہل چلاتیں، بوالی کرتیں یا پشتوں کی مرمت کرتیں۔ میرے باپ کو کھاد کے لیے گوربرادر فضلہ وغیرہ جمع کرنا ہوتا۔ عورتوں کے لیے کوئی درجہ نہیں تھا لیکن میری بیوی جو حاملہ تھی، مرغیوں اور سودروں کی دیکھ بھال کر کے تھوڑا بہت کمالیتی تھی۔

شروع شروع میں کیونٹوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنی پی او اے قریب قریب دیکھنی کر لیں گے اور ایک ماڈل زمین پر ایک ہزار کٹی چاول پیدا کر لیں گے لیکن مجھے شک ہے کہ کوئی بھی شخص، جن میں خود کا نیو بھی شامل تھے، اس بات کو باور بھی کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں چند ہی لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ کوئی آپریٹیون نظام کو فیض نہیں مارہے۔

دراسل تو ہمارے گاؤں کے کانوں کو یہ بات سرے ہی سے پسند نہیں تھی کہ وہ جامد اسے محروم ہو جائیں جیسے ہی انہوں نے مُناکہ کو آپریٹیون کا قیام عمل میں آ رہا ہے، تقریباً سبھی نے اپنی مرغیوں اور سودروں کو ہلاک کر دیا اور میوے کے درخت کاٹ ڈالے۔ انھیں دوسروں کے حوالے کرنے کی بجائے انہوں نے یہی بہتر سمجھا۔ جو لوگ گاؤں چھوڑ سکتے تھے وہ

لہ ایک کٹی ۱۵۰ پونڈ کے برابر ہوتی ہے۔

کنیٹن یا شیکسی جیسے شہروں میں چلے گئے یا میکاؤ یا ہانگ کانگ بھاگ گئے۔  
میرے جو میں آئی تھی کہ میں بھی بھاگ جاؤں لیکن اپنے خاندان کو چھپرنا کرنے  
کو میرا جی نہ چاہا۔ گاؤں کے اور بھی بہت سے لوگ یہی محسوس کرتے  
تھے اس لیے وہاں رہنے اور کام کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ طوفان  
اور بارش کے سامنے جھکانا ہی پڑتا ہے۔ ہم کام ضرور کرتے تھے لیکن ہمارے  
دل بمحضہ ہوئے تھے۔ جس ٹولی میں میرا باپ کام کرتا تھا وہ کھاد نیم دلی  
سے ہی اکٹھی کرتی تھی اور بوائی کے وقت کھاد ہمیشہ ناکافی رہتی تھی۔ میری  
بیوی نے مجھے بتایا کہ اس کی ٹولی میں کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ کوآپر میٹیو کے سوڑ  
مرتے ہیں یا جیتے ہیں۔

اگرچہ زمین سے محروم ہی کچھ کم بات نہیں تھی لیکن اس سے بھی بڑی  
بات یہ تھی کہ کوآپر میٹیو میں ہم سے جس طریقے سے کام لیا جاتا تھا وہ بہت ہی  
قابل اعتراض تھا۔ اگر ہم چادر کی سوکٹیاں پیدا کرتے تو ان میں سے نصف  
کا پوٹیکسوں اور دوسرے اخراجات کے سلسلے میں ہم سے لے لیتے۔ ان  
کا کہنا تھا کہ یہ شہروں کے مزدوروں کا پریٹ بھرتے کے لیے ہیں جو چین کی  
بڑی صنعتوں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ شکایت کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ دو  
کانوں کو جنھوں نے ناجائز ٹیکسوں کے خلاف احتجاج کیا تھا بعد میں  
اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ وہ امیر جاگیر داروں کے تنخوا ہیے تھے  
اور ان کے ایسا پر کوآپر میٹیو کی تنخیب میں مصروف تھے۔ جہاں تک میرے  
علم کا تعزق ہے، گاؤں میں کوئی جاگیر دار رہا ہی نہیں تھا لیکن ہمیں بتایا

یہی گیا کہ ان دونوں کسانوں نے اپنے جرم کا اعتراض کر لیا ہے اور اعتراض جرم کے بعد انھیں رہا کہ دیا گیا ہے۔

ہمارے گاؤں میں ناراضی پھیلی ہوئی تھی اور کانپواں کا ازالہ کرنے میں ناکام تھے۔ ہم میں سے بہت سے کسان یہ سمجھتے تھے کہ جو کمیٹی کو آپر میٹیو کا انتظام چلا رہی تھی وہ اتنے بڑے کاروبار کو چلانے کی اہل نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کئی بار یہ بات بھی برسی نظر آتی تھی کہ کمیٹی کے ممبروں کو کاشتکاری کے متعلق بھی زیادہ علم نہیں۔ مثال کے طور پر ماضی میں ہم دھان بونے کا یہ ذیقتہ اختیار کرتے تھے کہ دس پودے ایک جگہ لگا دیتے اور بھر دوسرے پودے دس اپنچھے جگہ چھوڑ کر رکاتے۔ لیکن کانپوؤں نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم دس کی بجائے ایک جگہ کم پودے لگائیں لیکن باہمی فاصلہ گھٹا دیں کئی بوڑھے کسانوں نے انھیں بتانے کی کوشش کی کہ دھان اس طرح بولایا گیا تو باش اور طوفان سے زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے لیکن کانپوان کی بات سننے کے ردا دار نہ ہوئے اور تعییل حکم پر بقدر ہے۔ بھر ہمارے گاؤں میں جو نئے ہل لائے گئے وہ اور بھی اجتماع نہ تھے۔ یہ ہل فولاد کے بننے ہوئے تھے اور ہر ہل میں دد پہنچتے اور دوپھل تھے۔ کانپو کہتے تھے کہ یہ جدید ترین اختراع ہے اور جیسے بھر میں اس قسم کے کروڑوں ہل استعمال ہو رہے ہیں۔ ان ہلوں کو دیکھتے ہی ہم نے کہہ دیا کہ وہ دھان کے کھیتوں کے لیے جن میں بہت زیادہ پانی دینا پڑتا ہے، نامزدوں ہیں، کیونکہ یہ بہت زیادہ وزنی ہیں لیکن کانپو بقدر ہے کہ انھیں ضرور آزمانا چاہیے۔ ہوا وہی جو ہم نے کہا تھا۔ جیسے

ہی انھیں کھیتوں میں لے جایا گیا وہ دُھروں تک زمین میں دھنس گئے۔ یہ بات کا نپرڈوں کے لیے بڑی پریشان کرنے تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک کانپو جھلہ گیا تھا اور اس نے غصے میں ہم سے کہا تھا کہ ہم احمد ہیں اور مشیری کا استعمال نہیں جانتے۔ بہر حال اس کے بعد نئے ہوں کی بات ختم ہو گئی۔ وہ ہمارے گاؤں میں یونہی پڑے رہے اور ہم انھیں خواہ یہ ہوں کے نام سے یاد کرنے لگے۔

میں کوئی خاص پڑھا کرنا آدمی نہیں ہوں اور میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ چین بھر میں کمپونٹ کیا کر رہے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ جہاں تک ہمارے گاؤں کے کوآ پرمیوں کا تسلق ہے، انھوں نے کافی غلطیاں کیں۔ ان کی ایک غلطی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ چاول کی پیداوار ہی کی بات کرتے تھے۔ کانپو ہمیں بار بار ہی کہتے تھے کہ ہمیں چاول کی پیداوار بڑھانی چاہیے لیکن ہمیں مچھلی، گوشت، سبزیوں، مزگ مچلی کے سیل اور دوسرا پیزدیں کی بھی ضرورت تھی۔ بہت سے کسان نظر بھا کر دھان کے کھیتوں سے نکل جاتے اور اپنے ترکاری کے باغوں میں کام کرنے لگتے کانپوؤں کو اکثر انھیں ڈھونڈ کر زبردستی دھان کے کھیتوں میں لانا پڑتا۔ ہمیں معلوم تھا کہ کانپو چاول کی پیداوار بڑھانے پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ اگر وہ پیداوار کے نشانوں کی تکمیل میں ناکام رہتے تو انھیں اور پرے سے اعلیٰ کمپونٹ افسروں کی طرف سے جھاڑ پڑتی۔ ظاہر ہے کہ غلطی شہنشاہ کرتے ہیں اور خمیازہ عوام سمجھ لگتے ہیں۔

دوسری بڑی غلطی کیوں ٹوں سے میرے خیال میں یہ ہوئی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ کوآپریٹو کا نظام از خود ہی چاول کی نسلوں کو بہتر بنادے گا اور اس نظام کی بدولت چاول کی نصل پیدا کرنا آسان تر بھی ہو جائے گا۔ ہر دو شخص جس نے بھی چاول کی فصل پیدا کی ہے، جانتا ہے کہ اسے خاص توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے پودوں کو بونا پڑتا ہے، پھر انھیں ایک جگہ سے اکھیر کہ دوسری جگہ لگانا پڑتا ہے اور پھر فصل تیار کی جاتی ہے۔ یہ سب کام پوری احتیاط سے ہاتھوں ہی سے کیا جاتا ہے، جیسا کہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک خاص احتیاط سے نگہداشت کی جائے چاول کی نصل اگ ہی نہیں سکتی اور فصل کی خاص نگہداشت کان انھیں کھستوں پر کرتے ہیں جو ان کی اپنی ملکیت ہوں۔ کئی بار ہم کا پروڈوں کو یہ کہہ کر چڑایا کرتے تھے کہ ہم کان تو کافی ترقی پت، میں لیکن یہ پودے امیرا در رجعت پسند ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جو کچھ میں نے اب تک بتایا ہے اس سے تھوڑا بہت اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چند ہی برس کے اندر ہماری زندگیوں میں کتنی بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ میں یہ کہوں گا کہ ہم میں سے بیشتر یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ ہمارے خاندانوں کا شیرازہ منتشر ہوا ہے لیکن یہ احساس میرے خیال میں ہم میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ اب ہم ایک نئے خاندان کا حصہ بن گئے ہیں۔ کانپوں نے کوآپریٹو کو یہی نام دیا تھا۔ خود گاؤں کا نقشہ بھی بدل گیا تھا۔ گھروں

کی دیواریں پوستروں سے پٹی پڑی تھیں اور بڑی سڑک پر جگہ جگہ یہ مولوں  
لٹک رہے تھے کہ ہمیں فصلِ جلدی بونی چاہیے اور خوب محنث کرنی چاہیے  
کھیتوں میں مٹی کی مینڈیں جو ایک کسان کی زمین کو دوسرا سے کسان کی  
زمین سے الگ کرتی تھیں، اب ناپید ہو گئی تھیں۔ پہلے جہاں چھوٹے  
چھوٹے قطعاتِ اراضی پر خاندانوں کو مل کر کام کرتے ہوئے دیکھا جاتا  
تھا وہاں اب کسانوں کی بڑی بڑی ٹولیاں بھیرٹ کے گلے کی طرح ایک  
ہی جگہ سمتی نظر آتی تھیں۔ کانپو ہمیتے تھے کہ کوآپریٹیٹ نظام بررسوں قائم ہے  
گا اور اس سے زندگی اتنی بہتر ہو جائے گی کہ اب جو ہمیں تکلیفیں ہوں ہی  
ہیں، آگے چل کر ہم انھیں بالکل بھول جائیں گے۔ بہر حال ہم اس کے  
سوکر بھی کیا سکتے تھے کہ کام کرتے رہیں۔ میرے باپ کا ایک دوست جو  
بیشہ خوش رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا، اکثر کسانوں سے کہا کرتا تھا  
”ہم اپنے دل کو یہ کہہ کر کیوں نہ تسلی دے لیں کہ اپنی جائیداد ہم جوئے میں  
ہار گئے ہیں۔“

میں نے کوشش کی کہ اپنے گاؤں کی نئی زندگی کا خوگر ہو جاؤں۔ غالباً  
میں یہ سمجھتا تھا کہ کانپروں کی باتِ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ کمیونٹ  
تصورات ایک دن ہمارے لیے واقعی مسیرت لے آئیں۔ یہ بات کس  
طرح ممکن ہے کہ آپ دن رات تقریباً میں اور نظرے سننے رہیں اور بالآخر  
یہ نہ محسوس کرنے لگیں کہ ان میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔ پھر مجھے یہ  
بھی تسلیم کرنما پڑے گا کہ اگرچہ یہ بات مجھے پسند نہیں تھی کہ کمیونٹ میں اجتماعی

تم کے کام کرنے کا حکم دیا کرتے تھے لیکن یہ بات مجھے متأثر کرئی تھی کہ وہ خود بھی کہہ سی محنت کیا کرتے تھے۔ کانپوہہیش جلسوں اور مباحثوں میں صرف رہتے تھے اور ان میں سے کئی صبح سے شام تک ہمارے ساتھ کھیتوں میں رہتے تھے۔ ایسا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہم سے بہتر غذا کھاتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ لوگ انہیں بے ایمان نہیں سمجھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا بھی مجھ پر اثر ہوا اور میں یہ سمجھنے لگا کہ اگر کانپوہ نے نظام پر اتنا ایمان رکھتے ہیں تو وہ بالکل ہی احمقانہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ ایسے دن تھے کہ ہمیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ہم کیا سمجھیں اور کس بات کی توقع رکھیں۔ ہم ابھی ایک نظام کے مشکل ہی سے خوکہ ہو پائے تھے کہ دوسرا نظام آوارد ہوا۔ یہ ۱۹۵۶ء کے اوآخر کی بات ہے۔ چاول کی دوسری فصل کو کائے ابھی ایک ہی ہمینہ ہوا تھا۔ موسم اس وقت بہت اچھا تھا اور خواہ ٹو ٹیکیں سی کام کرنا ہمیں پسند تھا یا نہیں، یہ داقعہ ہے کہ اس برس یہ امید تھی کہ اب کی فصل بہت ہی ابھی ہوگی۔

ایک دن صبح سویرے جب میں فصل کی چھٹائی کے لیے اپنی ٹولی کے ساتھ کھیتوں میں جانے کی تیاری کر رہا تھا تو کسان انجمن کے کئی لیڈر گھڑیاں بجاتے گلی میں سے گز رے۔ وہ اعلان کر رہے تھے کہ کھلیان میں ایک اہم جلسہ منعقد ہو گا۔ میری ماں ہمارے دونوں کے ساتھ گھر پر رہی اور میں میرا بابا اور میری بیوی جلے میں گئے۔ گاؤں کا تقریباً ہر شخص دہل موجید

تھا اور کسی نے مجھے بتایا کہ یانکنگ کا ایک بہت بڑا فرائیک اہم تفہیری کرنے والا ہے۔ ہم انتظار کرنے لگے۔ آخر ایک دبلا پلا آدمی جس نے عینک لگا رکھی تھی، پلیٹ فارم پر آیا اور کاغذ سے کچھ پڑھنے لگا۔

اس کی بربات دہرانا میرے لیے ممکن نہیں لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارا معیارِ زندگی اب چونکہ کافی اونچا ہے اس لیے اب یہ ضروری ہے کہ ہم ایک نئے نظام کی ابتدا کریں۔ اس نے نئے نظام کو اس نے عوامی کیونوں کے نظام کا نام دیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اب تک ہم سو شاہ سماج میں تھے لیکن اب ہم کیونٹ سماج میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ کیونٹ سماج ایک جنت ہے اور عوامی کیون اس جنت تک پہنچنے کی سیر ٹھی ہیں۔ عام تقریرہوں کے مقابلے میں یہ تقریر کافی مختصر تھی۔ افسر نے اپنی تقریر یہ کہہ کر ختم کر دی کہ اس نے خیال کے متعلق ہمیں اپنے ساتھیوں سے بات چیت کرنی چاہیے اور یہ نصیلہ کرنا چاہیے کہ کیا ہم عوامی کیون منظم کرنا چاہتے ہیں۔

اس شام ہم آبائی ہال میں گئے جواب سکول کا کام دیتا تھا۔ دو یمن کا نپو وہاں موجود تھے۔ ہم سب کو اس قسم کے مباحثوں کا تجربہ تھا اور یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم تھی کہ اس سے کئی فرق نہیں پڑتا کہ عوامی کیونوں کی ایکیم کے متعلق ہماری اپنی رائے کیا ہے۔ ہم سوال پوچھ سکتے تھے لیکن بالآخر یہ ضروری تھا کہ ہم نئے نظام کو تسلیم کر لیں۔ اگر کوئی شخص

انقلاب کرتا تو کیونٹ بڑے سکون سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ اس کی بات غلط کیوں ہے اور اگر وہ مخالفت پر بضدر ہتا تو ہم سب کا یہ فرض تھا کہ ہم اس ضدی آدمی کو گالیاں دیں اور جب تک وہ رفاسند نہ ہو جائے، اسے پسند نہ اور مینی کہہ کر پکارتے رہیں۔

بہر حال ہمیں یہ جانتے کا اشتیاق ضرور تھا کہ عوامی کیونٹ سے کیا مراد ہے اور جب ایک کاپنواں کی وضاحت کرنے لگا تو ہم سب اس کی بات کو بڑی توجہ سے سننے لگے۔ اس نے ابتدایہاں سے کی کہ کوآپریٹیو اداروں کی کارکردگی کوئی خاص اچھی نہیں تھی کیونکہ یہ کوآپریٹیو کافی بڑے نہیں تھے۔ لیکن عوامی کیون لازمی طور پر بہتر کارکردگی کا ثبوت دے گا کیونکہ یہ صرف ایک گاؤں پر ہی نہیں بلکہ پوری تحصیل پر مشتمل ہو گا اور اس میں شامل ہونے والوں کی تعداد سات آٹھ ہزار نفوس سے کم نہیں ہوگی۔ کاپنے کے تشرح کرتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ ہم حقیقی کیونزم کے دور میں داخل ہو رہے ہیں، بخشی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ ترکاری باغ، آلات کاشت، مچھلیاں کپڑنے کے جال، مکان، بچلوں کے درخت حتیٰ کہ سایہ دار درخت بھی اب مشترکہ ملکیت ہوں گے۔ بوڑھوں کے لیے اپانچ گھر ہوں گے اور بچوں کے لیے زسریاں۔ طعام گھروں میں ہر کوئی پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے گا۔ کاپنے کے لیے "اب کسی کو یہ تشویش نہیں ہوگی کہ کھانا کہاں سے آئے گا اور کہاں پکے گا۔ اب پیداواری کا مول میں زیادہ وقت لگایا جا سکے گا۔"

چند ہی دن میں "طعام گھر" گھل گئے۔ پتہ چلا کہ طعام گھر سے مراد

چند میز سی اور چند بیجیں تھیں جو کھلیاں کے ایک کونے میں رکھی تھیں۔ لیکن کھانا جرأت نہیں تھا۔ کم از کم شروع میں تو تھیں۔ ہمیں دن میں دوبار کھانا ملتا تھا، صبح کافی دیر سے اور شام کو کافی جلدی۔ چاول اور سبزیاں پر افراط ملتی تھیں اور گوشت یا مچھلی کبھی کبھی۔ لیکن یہ اچھے کھانے زیادہ دن تک نہیں چل سکے۔ چند ہی ہفتوں کے بعد راشن سسٹم شروع ہو گیا۔ جب ہمارے حصے کا راشن ملتا تو ہم قطار بنائے کھڑے ہو جاتے۔ پھر راشن لے کر اسے پکڑنا پڑتا۔ کاپوؤں کا کہنا یہ تھا کہ یہ اصراف بیجا کو بچانے کے لیے ہے لیکن ہر شخص اس طریقے کا شاکنی نظر آتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ زیادہ تشویش، ہمیں راشننگ سے نہیں تھی کیونکہ ماضی میں بھی بدحالی کے آیام میں ہم پیٹ پر پھر باندھنے کے عادی تھے لیکن عین اس وقت جب راشن کی مقدار گھٹائی جا رہی تھی کاپوؤں نے اضافہ کا رکھ کیا شروع کر دی اور ہمیں ڈھیر ڈھنگروں کی طرح ہانکرنے لگے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ عوامی کیوں کی ابتداء کے چند ماہ بعد کی کہانی میں کہاں سے شروع کروں۔ کاپو بار بار یہ فقرہ دہرا رہے تھے کہ ہم "لبی چھلانگ" لگا رہے ہیں۔ جنوں کا ایسا ماحول میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

انہائی فوری کام چاول کی دوسری فصل کی کٹائی تھی۔ کاپو ہمیں کہتے تھے کہ ہمیں اپنے آپ کو "پیداوار پر بلغار بولنے والی ایک فونج" سمجھنا چاہیے۔

ہمیں فوراً ہی ٹولیوں اور برگیڈوں میں بانٹ دیا گیا۔ کسانِ انجمن کے لیڈر اور نوجوان مجادہ ہماری کمان کر رہے تھے۔ جیسے ہی صبح کامنغا اذان دیتا رڑکے گلیوں میں بھاگ دوڑ کرنے لگتے اور گھر یاں بجا بجا کر، ہمیں جگاتے۔ ہمیں ہاتھ منہ دھونے، کپڑے پہننے اور پانی مینے کے لیے چند سی منٹ کی نہلت ملتی۔ روشنی پھیلتے ہی ایسا نظر آنے لگتا کہ سارا گاؤں پاگل ہو گیا ہے۔ گھر یاں بجئے لگتے، کاپوؤں کی سیاں گونجھے لگتیں اور مختلف ٹولیوں میں شامل ہونے کے لیے لوگ ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے۔ پھر ہم فوجیوں کی طرح کھیتوں کی طرف کوچ شروع کر دیتے۔ پہلے ہفتے ہر ٹولی کے لیے سرخ جھنڈا لے کر چلنا ضروری تھا لیکن بعد میں اسے ترک کر دیا گیا۔

کٹائی کے دنوں میں ہم پہلے بھی زیادہ کام کیا کرتے تھے لیکن اب تو ہمیں دن میں سولہ اور بیس بیس گھنٹے کام کرنا پڑ رہا تھا۔ کئی باہم رات گئے تک لاٹینیں جلا کر کھیتوں میں کام کرتے رہتے۔ کبھی کبھی کچھ لوگ آنکھ بچا کر اندر چیرے میں کھسک جاتے اور زمین پر لیٹ کر ستانے لگتے لیکن کاپوں فوراً ہی ان کا پیچھا کرتے اور دوبارہ کام پر لگا دیتے۔ کبھی کبھی مجھے ایسی تھکن محسوس ہوتی کہ قدم اٹھائے نہ اٹھتے۔ ایسے عالم میں ہمیں گاؤں واپس لایا جانا۔ وہاں بھی جلسوں، جلوسوں کی وحہ سے رات بھر شور و شر رہتا۔ ایک مرتبہ گانے والوں کی ایک ٹولی نے عوامی کمیونوں کے متعلق ایک گیت گایا اور ایک مرتبہ اس موضوع پر کچھ ڈرائے بھی کھیلے گئے۔ نوجوان ہم جوؤں کے کلب کے پچھے ڈھولتا شے بجا تے ہوئے گزرتے اور اس طرح کے نعرے

لگاتے: "اب ایک سال ماضی کے ہزار سال کے برابر ہے" "اب ایسی  
مرست نظر آ رہی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی" اور ظاہر ہے کہ جلسے تو ہوتے  
ہی رہتے تھے۔

ان دنوں کیوں کی تنظیم میں مدد دینے کے لیے کئی نئے کانپوہارے  
گاؤں میں آئے اور ان کی آمد پر متعدد جلسے ہوئے۔ کانپوہوں نے کئی موضوعات  
پر تقریریں کیں لیکن ایک تقریر بمحضے خاص طور پر یاد ہے جس کا عنوان "نیا  
خاندان" تھا۔ ایک کانپونے اس تقریر میں کہا تھا کہ کمیڈن اب ہمارا خاندان  
ہے لہذا ہمیں صرف اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں سے ہی محبت نہیں  
کرنی چاہیے بلکہ سوسائٹی کے تمام افراد کے ساتھ محبت کرنی چاہیے۔ غالباً  
یہ تقریر خاص طور پر بمحضے اس لیے یاد ہے کہ کئی کسانوں نے جرأت سے کام  
لے کر یہ کہا تھا کہ اتنے بڑے خاندان میں شمولیت انھیں پندرہ ہیں۔ ایک دمی  
نے کہا تھا "سب لوگ چونکہ ایک ہی جگہ کھانا کھاتے ہیں اس لیے گھر تو اب  
باتی ہی نہیں رہا۔ گھر تو اب صرف سونے کی جگہ ہے کہ رہ گیا ہے" دوسرے  
نے کہا تھا "ماضی میں ہم جو چاہتے کھاتے پیتے۔ گھر کے سب لوگ مل کر  
بیٹھتے۔ باقیں کرتے اور رہتے بولتے۔ یہ ماوں کتنا پرمست اور خوشگوار  
تھا۔ اب بچے اس طرح جوان ہوں گے کہ اپنے باپ کے لیے ان کے دل میں  
کوئی احترام نہیں ہوگا اور بیویاں اپنے خاوندوں کے لیے اجنبی بن  
جائیں گی"۔

کا نپوں نے ان کسانوں کی باتوں کو غور سے مُنتہا۔ پھر اس نے بڑی زمی سے انھیں سمجھا یا کہ ان کا روایتی غلط ہے کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھ رہے کہ ہر چیز بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ پرانے طرز کا گھرانہ امیروں کے لیے تو خوب تھا لیکن غریبوں کے لیے یہ ایک بخوبی تھا۔ نئے نظام کے تحت گھر جمہوری بن جائے گا۔ عورتیں آزاد ہوں گی اور ان کا درجہ مردوں کے برابر ہو گا۔ بچوں کا خیال رکھا جائے گا اور باپ کا جبر ختم ہو جائے گا۔ اس نے کہا ”جو شخص یہ کہتا ہے کہ خاندان ختم ہو رہا ہے وہ غلطی پر ہے اور اتهامِ راشی کا مجرم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جاگیر دارانہ طرز کے خاندان کی جگہ اب ایک ترقی پسندانہ خاندان لے لے گا۔ اس تبدیلی سے کچھ عناصر کو غصہ ضرور آئے گا لیکن عوام کی کثیر تعداد کو اس سے مسترت ملے گی۔“

شروع کے برسوں میں جب کیونٹ کوئی نیا پروگرام شروع کرتے تھے تو ابتداء میں بڑا جوش پھیلا تھا لیکن بعد میں یہ جوش ماند پڑ جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب بھی یہی ہو گا لیکن میں غلطی پر تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ہم سے یہ مطالبے زور پکڑتے گئے کہ ہمیں زیادہ محنت کرنا چاہیے، زیادہ تیزی سے کام کرنا چاہیے اور بہتر کام کرنا چاہیے۔ ۱۹۵۸ء کی کٹائی سے ہم فارغ ہوئے ہی تھے کہ کانپوؤں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہمارے گاؤں میں فولاد بننے کا کہنا تھا کہ فولاد کی چونکہ ملک کو ضرورت ہے اس لیے اس کی تیاری بہت ضروری ہے۔

پہلے پہلے ہمارا خیال تھا کہ کانپو سنجیدہ نہیں ہیں لیکن بہت جلد انھوں نے

ہمیں حکم دے دیا کہ ہم بھیاں بنانے کے لیے انٹیں اور پتھر جمع کریں۔ لوہے کی تلاش میں ٹولیاں گھر منے لگیں۔ انھوں نے چند دروازے اور ادھر ادھر سے لوہے کے کچھ طکڑے جمع کر لیے۔ ہم چونکہ اب گھر پر کھانا نہیں پکاتے تھے اس لیے انھوں نے ہم سے کہا کہ ہم اپنی پرائیں اور دیگر بھی ان کے حوالے کر دیں۔ بیشتر عورتوں نے یہ چیزوں میں چھپا دیں اور دینے والے انکار کر دیا۔ ایندھن کی بھی ضرورت تھی، اس لیے کچھ ٹولیوں کو درخت کاٹنے کے لیے پہاڑوں پر بھیجا گیا۔ کچھ پہل دار درخت بھی کاٹ دیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نے گاؤں میں تقریباً چھاس بھیاں قائم کیں۔ انھیں رات بھر چالوں کھنے کے لیے ہم ٹولیاں بنائے کام کرتے تھے۔ ہماری حالت ایسی تھی جیسے اندر آدمی اندھے گھوڑے پر سوار ہو۔ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ فولاد کیے بنائی جاتی ہے لیکن کانپوؤں کے لیے یہی کافی تھا کہ ہم آگ نہ بھینے دیں۔ میں کھیتوں سے واپس آ کر شام کو بھٹی کے کنارے بیٹھ جاتا اور صبح تک آگ جھونکتا رہتا۔ نیچے میں میں سو بھی جاتا۔ کم سے کم اتنا ضرور تھا کہ اس طرح رات کو گرمی بیسٹر آ جاتی تھی۔ میری بھٹی میں سے دھات کے کچھ چھوٹے چھوٹے تو دے نکلے۔ باقی بھیوں کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ فولاد سازی کو شروع کیے ایک ہمینہ بھی نہیں گز را تھا کہ کانپوؤں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ پھر کسی نے اس کی بات نہیں کی۔

بھیوں کے کام سے فراغت ملی ہی تھی کہ تقریباً تین سو اشخاص کو منتخب کر کے آبی منصوبوں پر لگا دیا گیا۔ ان میں میرا باب پ بھی تھا اور وہ کئی ہفتے گھر سے

دور رہا۔ اس کی ٹولی گاؤں گاؤں گھومتی اور مٹی کی ٹوکرے یاں ڈھونڈھوکہ نہ یوں پر بندھ دیا جاتا۔ میں گاؤں ہی میں رہتا تھا کہ چاول کی نصل بونے میں ہاتھ بٹاؤں۔ جو کانپوہارے ساتھ کھیتوں میں آتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اب ہمیں نصل کے لیے زمین کو نئے طریقے سے تیار کرنا چاہیے۔ پہلے کی طرح ہل چلانے کی بجائے اب یہ ضروری تھا کہ ہم تین ٹوٹ تک زمین کھو دیں اور مٹی کی چلی تھوں کو ادپر لے آئیں۔ کانپوؤں کا کہنا تھا کہ اس طرح وہ کھاد جو گز شستہ برسوں میں نیچے جاتی رہی ہے، ادپر آجائے گی۔ بات کچھ زیادہ غلط نظر نہیں آتی تھی لیکن اگر اس طرح زمین کھو دی جاتی تو کام پورا کرنے میں پورا برس لگ جاتا۔ شروع شروع میں کانپوؤں کو ہماری بات کا یقین نہیں آیا اور وہ رات رات بھر ہم سے کھدائی کرتے رہے لیکن بالآخر ان کی سمجھ میں بھی آگیا کہ یہ کام ناممکن ہے اور انھوں نے ہمیں پہلے کی طرح ہل چلانے کی اجازت دے دی۔

اس مرتبہ ہمارا بہت سا کام اکارت گیا۔ موسم بہار کے اواخر میں جب کٹائی میں تقریباً ایک ہیمنہ باقی تھا، بارش شروع ہو گئی۔ ایک ہفتے تک مثلا دھار بارش ہوتی رہی اور اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہماری چھت پلکنے لگی اور گھر کا فرش پانی سے بھر گیا۔ ضلع بھر میں بندھ اور پل ٹوٹ گئے اور ہم نے یہاں تک ناکہ کنٹین اور ہانگ کانگ کے درمیان ریل کی پٹری بھی ٹوٹ گئی۔ کانپوؤں نے ہمیں بتایا کہ ہزاروں مکان بر باد ہو گئے ہیں اور بیس لاکھ ماؤں کے قریب نصل تباہ ہو گئی ہے۔ یہ تباہی زیادہ تر

دی یونگ کے نواح میں ہر بھی جو ہمارے گاؤں کے مشرق میں تھا۔ ہماری اپنی چاول کی نصل بھی دو تھائی تباہ ہو گئی اور ترکاری کے باع بھی تباہ ہو گئے۔ گاؤں کے جو بہڑوں میں چونکہ پانی آگیا تھا اس لیے مچھلیاں بھی بہہ گئیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس سے دس سال پہلے بھی گاؤں میں ایک خطرناک سیلا ب آیا تھا لیکن اب کے صورت حال خراب تر ہے۔ بوڑھوں کا کہنا تھا کہ اس سے پہلے آنا بڑا طوفان کبھی نہیں آیا۔ بوڑھی عورتیں کہتی تھیں کہ خدا نے حکمرانوں سے ناراض ہو گیا ہے لیکن میں اس بات کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

سیلا ب سے قبل کا نپوہمیں یہ بتایا کرتے تھے کہ رفتہ رفتہ ہمیں کم زمین بونی پڑے گی اور ہم زیادہ گہرا ہاں چلا کر، قریب قریب پودے لگا کر اور زیادہ کھاد استعمال کر کے فی ماڈ زیادہ فصل اگا سکیں گے لیکن اب وہ بالکل متضاد باتیں کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں زیادہ زمین میں کاشت کرنی چاہیے اور زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ ہم نے ہر جگہ سبزیاں بودیں۔ اپنے مکانوں میں، گلیوں میں اور کھیتوں میں بہنے والی نہروں کے گنائے۔ ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا کہ ہم پہاڑوں پر اپنے بزرگوں کی قبریں کھود کر وہاں بھی کاشت کریں۔ اس سے گاؤں میں ناراضی بچھیل گئی۔ ایک کا نپوہنچ کیا:

”پرانے توہمات پر فائمُرہ کرہ ہم نیا ملک نہیں بنائے سکتے۔“ لیکن اس قسم کے فقردوں سے لوگوں کی ناراضی کم نہیں ہوئی۔

زیادہ بہر چینی اس بناء پر تھی کہ خوراک کی کمی تھی۔ ہم جواناچ پیدا کرتے

تھے اس کا تین چوتھائی گیونٹ رے جاتے تھے۔ یہ غالباً شہری باشندوں کے لیے تھا۔ ہمارے لیے ناج بہت ہی کم بچتا تھا۔ بیشتر سو رہی روں تک پنج دیے گئے۔ کم از کم لوگ یہی کہتے تھے۔ ہمارے لیے گوشت برائے نام ہی رہ گیا۔ مخصوص ہمیں کبھی کبھار سی ملتی تھی اور سبزیاں بھی قریب قریب ناپید تھیں۔ اب ہمیں چاول کا راشن ٹول کرنے ہیں ملتا تھا بلکہ ابلا ہوا چاول دیا جاتا تھا۔ یہ بہت پلا ہوتا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ چاول دوبار پکایا جاتا ہے۔ بعض کسان کھلے بندوں کہتے تھے کہ خالی پیٹ کام نہیں ہو سکتا۔ بیشتر لوگ بر ملا بات کہنے سے ڈرتے تھے لیکن صحیح صحبتوں میں فقرے کتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص خود اک کی قلت کی شکایت کر رہا ہوتا تو دوسرا کہتا "اے بھائی چب پر ہو ہم جنت میں ہیں" یا "صبر سے کام لو۔ ہزار سالہ درست شروع ہونے والا ہے"۔

میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم بھروسے اس لیے تھے کہ فصل ناقص ہوئی تھی یا فصل اس لیے ناقص ہوئی تھی کہ ہم بھیو کے تھے۔ غالباً دونوں ہی باتیں سچ تھیں۔ بہر حال سنہ ۱۹۶۴ء کے اوآخر میں جب چاول کی دوسری نسل بھی ناقص رہی، ہمارے گاؤں کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی۔ ہمیندوں تک ہمیں چار پانچ سو چاول سے زیادہ نہیں ملا۔ شور ہے بھی ہمیں چاول کے چھلکے کا ملتا تھا جو بڑا بڑا ذائقہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس میں آلو بھی ڈال دیے جاتے تھے۔ کرم کلہ یا بنگن کا کوئی سکھڑا ہمیں کبھی کبھار سی ملتا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں سیسم کے بیجوں کا بنا ہوا دہی بھی مل جاتا۔ گوشت ہمیں صرف نوروز کے دن ملتا، انگلی کے برابر صرف ایک ٹکڑا۔ نصیبت کے ان دنوں میں کانپوں ہمیں مسلسل کہتے رہتے کہ ہم زیادہ کام کریں۔ جلسوں میں ہمیں وہ سرماؤں کے قصے سناتے جو جو خالی پیٹ کام کرتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر کنفیوشن کا شاگرد یعنی ہوئی جو

کھانے کی صرف ایک پیٹ اور پانی کے ایک پیالے پر زندگی گزارتا تھا۔ کانپو  
ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے اور میرا خیال ہے کہ وہ ہم سے کہیں نہ یادہ  
کھاتے تھے اس لیے ان کے لیے اس قسم کی باتیں بنانا آسان تھا۔

بہت سے لوگ ان دنوں بیمار ہو گئے۔ تقریباً ہر شخص کے ٹھنڈے سوچ  
گئے۔ میرے باپ کے ہاتھ پاؤں قریب تر چھکنے لگے۔ میں اسے ایک  
پرانے آبائی ہال میں لے گیا جہاں کچھ ڈاکٹر دل نے جو غالباً طالب علم تھے، ایک  
ٹکین کے فائم کر رکھتا تھا۔ عمارت کے اینٹوں کے فرش پر گھاس اور چاول کے  
چھلکے پڑے تھے۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر بوڑھے مرد اور عورتیں تھیں۔ ان  
میں سے بیشتر کی کرسی جھکی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھ اور بازوں سوچ ہوئے  
تھے۔ ایک ڈاکٹر نے میرے باپ کو کچھ گولیاں دیں اور ہم واپس آگئے۔ چند  
جنتوں کے بعد میرے باپ کی سوچن کھم ہو گئی لیکن وہ بہت دُبلا ہو گیا۔ اور  
نقاہت کی وجہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے میرا باپ بہت  
زیادہ بوڑھا نہیں تھا۔ کئی بوڑھے بیماری کی وجہ سے مر گئے۔ یہ بات زیادہ  
افسوس ناک اس لیے تھی کہ کفن دفن کا مناسب انتظام نہیں تھا۔ کانپوؤں نے  
ان کے خاندانوں کو ناالباق پڑا ضرور دیا لیکن تابوت بنانے کو کافی لکھڑا سی نہیں  
دی۔ مجھے رد رہ کر یاد آ رہا تھا کہ فولاد بنانے کی ناکام کوشش میں کتنی لکڑی بیکار  
جلاد دالی گئی تھی۔

ان دنوں ہر سوچ میں گڑا بڑا تھی۔ کنٹین سے ایک سو کے قریب لوگ گھسیتوں  
میں ہمارا ہاتھ بٹانے کے لیے ہمارے گاؤں آئے۔ ان میں سے ایک جو ہماری

ہی ٹیم میں کام کر رہا تھا، میرا واقف بن گیا۔ وہ ایک فیکٹری میں کام کر چکا تھا اور شہر میں اپنے خاندان کے ساتھ ہی رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی فیکٹری کے میجر نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ گاؤں جانے کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کر دے۔ اس نے انکار کیا تو اسے ملازمت سے معطل کر دیا گیا اور اسے یہ بتایا گیا کہ اس کا خوراک کاراشن ہمارے گاؤں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہمارے گاؤں میں آنے کے سوا اس کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ فیکٹری کے مزدوروں اور طالب علموں کو دیہات میں کیوں بھیجا جا رہا ہے جبکہ کتنیں کا شہر گاؤں کے لوگوں سے بھرا پڑا۔ یہ جو خوراک کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے ہیں۔ یہ لوگ شہر کی گلیوں میں آوارہ گھوم رہے تھے اور کوئی شخص ان کے ہاتھ پر کچھ لئنے کا رادار نہیں تھا۔ لڑکیاں کھانے کے لیے اپنی عزت تک گزار رہی تھیں۔ اس نے کہا کہ نصف کٹی چاول کے راشن کے بدے گاؤں کی لڑکی حاصل کی جاسکتی تھی جبکہ پیشہ ور زندگیوں کا نرخ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ زندگیوں کے لیے اپنا پیشہ چلانا کافی خطرناک تھا کیونکہ اگر وہ پکڑتی جاتیں تو انھیں مشقت کے اصلاحی کمپ میں بھیج دیا جاتا۔

روٹی کی تصویریں بنانے کے بعد کہ نہیں مٹائی جاسکتی لیکن اس سارے عروض میں کا پوچھیں یہی بتاتے رہے کہ حالات سُدھ ر جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہم سے زیادہ پر اگنے دماغ تھے۔ ایک مدت تک وہ طعام گھر کی اہمیت

کے متعلق رطب اللسان رہے تھے اور ہمیں یہ بتاتے رہے تھے کہ گھر پر کھانے کا طریقہ فرسودہ ہے اور اس سے بیجا امتلاف ہوتا ہے لیکن اب رفتہ رفتہ وہ کہنے لگے تھے کہ بیرونی طعام گھروں کا تصور کچھ اتنا اچھا نہیں تھا کیونکہ اس پر بہت زیادہ محنت صرف ہوتی تھی اور بڑے کھن کے لیے بہت زیادہ کوئلہ درکار ہوتا تھا لہذا اگر لوگ چاہیں تو اپنے گھر پر بھی کھا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت آگئی کہ کوئی بھی شخص کھلیاں میں نہ جاتا۔ لوگ صرف اپنا راشن وصول کرنے والے جاتے اور کھانا گھر پر ہی پکاتے۔

باقی امور میں کاپنواں سے بھی زیادہ پر اگندرہ خیالی میں مبتلا تھے۔ مثال کے طور پر کوآپر میٹو کے نظام کے تحت ہمیں اس کی اجازت تھی کہ ہم سبز یا ان اگانے کے لیے زمین کا ایک چھوٹا سا طحراً اپنے پاس رکھ سکیں لیکن جب کمیون قائم ہوا تو ہمیں بتایا گیا کہ اب ہر چیز کمیون کی ملکیت ہے اور ہم کوئی بھی زمین اپنی بھی ملکیت میں نہیں رکھ سکتے۔ ایک ہی سال کے بعد کاپنوا پھر کہنے لگے کہ ہم اپنے زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے واپس لے سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں سرخ کارڈ دے دیے جن پر لکھا تھا کہ یہ زمین ہماری ملکیت ہے اور ہم یہاں جو نصل چاہیں، اگاہ سکتے ہیں۔

بیرے خاندان کو بھی ایک چھوٹا سا زمین کا محرداً مل گیا اور میرے باپ نے اور میں نے وہاں کرم کلہ اور بنیگن بو دیے۔ تین ہمینے کے بعد کاپنواں نے ہمیں سچھا کھا کیا اور بتایا کہ کمیون ہمیں کھانے کو کافی دے گا اس لیے بھی ترکاری باغ رکھنا غلط ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان ترکاری باغوں میں جو کچھ بھی اُسے گا

وہ ہمیں کیوں نہ کو دینا پڑے گا۔ ایک بوڑھی خورت کچھ کرم کلے گھرے گئی تو اسے چوری کا ملزم گردانا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کسان بہت ہی بڑھ تھے۔ بعض کسان کہتے تھے کہ کانپوچھر اور لٹیرے ہیں اور داؤ کوؤں سے بھی بدتر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں کے شکوئے شکایت نے کانپوچھوؤں کو بھی پریشان کر دیا۔ انھوں نے ہمارا جلسہ بلا یا اور ہمیں کہا کہ اگر ہم ترکاریاں اگانا چاہتے ہیں تو اپنے طھروں کی چھٹ پر ہی اگا سکتے ہیں۔ بعض کسانوں نے واقعی اپنی چھٹوؤں پر ربوز کی بلیں لگادیں۔ اس پر کچھ لوگ کہنے لگے "اگر تمھیں زمین درکار ہے تو اب وہ ہوا ہی میں ملے گی"۔

گزشتہ برس یہ صورت حال بھر بدل گئی اور ہمیں اجازت دے دی گئی کہ ہم اپنی کچھ زمین پر ترکاریاں لگا سکتے ہیں۔ یہ زمین کچھ زیادہ نہیں تھی۔ بجتوں کو چھوڑ کر، خاندان کے ہر فرد کو ایک مارڈ کا پانچواں حصہ ملا۔ ہمارے گھر میں چار افراد تھے اس لیے ہمیں قریب تریب ایک مارڈ زمین مل گئی۔ کہتے ہیں ایک خوشی سینکڑوں غموں کا ماردا ہے۔ ہم سب خوش تھے کہ ہمیں زمین کا ایک پھوٹا سا مکڑا مل گیا ہے۔ میں، میرا باپ اور میری بیوی نوراً ہی کام میں لگ گئے۔ ایک کانپوہمارے پیچھے پیچھے آیا اور اس نے ہمیں بتایا کہ ہم اپنی زمین پر صرف فالتو وقت ہی میں کام کر سکتے ہیں۔ کانپوؤں کے لیے لوگوں کو لکھیتوں پر کام کے لیے لے جانا کافی مشکل تھا کیونکہ ہر شخص قدرتی طور پر ہمیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ترکاری باغ ہی میں کام کرے۔ کچھ لوگ مرغیاں اور سورجی پالنے لگے لیکن یہ کام بہت ہی کم لوگ کر سکتے تھے کیونکہ مرغیاں

اور سور خریدنے کے لیے پہنچے کی ضرورت تھی۔

گمیونسٹوں نے یا انکنگ کی منڈی بھی پھر سے چالو کر دی اور لوگوں کی  
حوالہ افزائی کی کہ وہ اپنی ترکاریاں اور جانور فروخت کے لیے وہاں لے جائیں  
ایسی کئی چیزیں جن کا راشن تھا اس منڈی میں آزاداً فروخت ہوتی تھیں  
مثلاً تو لیے، دانتوں کے گرش، کپڑا، صابون اور سگریٹ۔ جب ہم نے  
پہلی بار یہ بات سنی تو ہم نے سمجھا کہ یہ منڈی یا انکنگ کی پرانی منڈی کی طرح  
ہی ہوگی۔ لیکن صورت حال بالکل مختلف تھی۔ قلمیتیں اتنی زیادہ تھیں کہ ہم ان  
کے کفیل مشکل ہی سے ہو سکتے تھے۔ میری آمدنی آٹھ یو آن ماہوار تھی۔ میں  
سگریٹ کے ایک پیکٹ کے پانچ یو آن یا کپڑے کے ایک میٹر کے چار یو آن  
کیسے دے سکتا تھا؟ اپنی آمدنی کے مطابق مجھے آزاد مارکیٹ میں سور کا ایک  
کٹی گوشہ خریدنے کے لیے پانچ ہفتے کی محنت کا معاوضہ خرچ کرنا ہوتا۔  
جن خاندانوں کو ہانگ کا ہنگ میں اپنے رشہ داروں سے روپیہ آتا تھا۔  
وہی آزاد مارکیٹ میں چیزیں خرید سکتے تھے یا پھر کا پتو جنہیں پنیٹھ یو آن  
ماہوار ملتا تھا۔ پھر بھی مجھے اور میرے باپ کو منڈی کی بات پسند تھی۔ ہم نے  
کچھ روپیہ بچایا اور کچھ چوزے خرید لیے۔ ممکن تھا کہ ہم کبھی انہیں ہنگے داموں  
فروخت کر سکیں۔

**محنت کا طریقہ بھی بدلتا گیا۔ پہلے جہاں ہم ہر صبح کھیتوں کو سپاہیوں کی**

**لہ ایک یو آن درود پے کے قریب ہوتا ہے۔**

طرح کوچ کرتے ہوئے جاتے تھے، وہاں اب ہم نے جیسا کہ اہزاد بائیکی کی ٹولیوں کے وقت دستور تھا، اس دس پندرہ پندرہ خاندانوں کی ٹولیوں میں جانا شروع کر دیا۔ کانپوؤں کا روئیہ بھی ہمارے میں بدل گیا۔ اگرچہ ان میں سے چند اب بھی ہم پر حکم چلانا ہی چاہتے تھے لیکن ان میں سے اکثر اب ہم سے مشورہ بھی لینے لگے۔ مشاں کے طور پر گز شستہ موسم گرم ماں میں چاول کی دوسری فصل بونے سے پہلے ایک کانپوؤنے ہم سے بات چیت کی اور جب ہم نے اسے بتایا کہ ہم کس قسم کی فصل کی موقع رکھ سکتے ہیں تو اس نے ہماری بات کو وضیان سے ٹھانے لیا۔ آخر ہم نے اتفاق رائے سے ایک نشانہ مقرر کر لیا لیکن موسم کی خرابی کے باعث ہم یہ نشانہ پورا نہیں کر سکے۔ ہم اسٹور سے کچھ چاول ادھار لینے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن خوراک پھر بھی ناکافی ہی رہی۔

گز شستہ موسم سرماں میں حالت خاص طور پر خراب رہی۔ کھانے کے لیے بہت کم تھا، ایندھن برائے نام تھا اور گھر میں لمب پ جلانے کے لیے تسلیم تک نہیں تھا۔ اس سے بُری بات یہ ہوئی کہ میری یہ امید ہی اٹھا گئی کہ زندگی کبھی بہتر بنے گی۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس ترکاریاں آگانے کے لیے تھوڑی سی زمین تھی لیکن کانپو جب بھی چاہتے یہ زمین چھین سکتے تھے۔ وہ جب چاہتے ہم سے پاہیوں کی طرح مارچ بھی کر سکتے تھے۔ یہ سب باقی میرے ذہن میں آتیں اور میں سوچنے لگتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

ایک رات میں سونے کی کوشش کر رہا تھا اور نیند نہیں آتی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ بھاگ کیوں نہ جاؤں۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ میکاڈ یا  
ہانگ کانگ چلے جانے کی بات میرے ذہن میں آئی۔ صرف یہ ڈر مجھے بھاگنے  
سے روک رہا تھا کہ مجھے اپنے خاندان کو چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن اب میں اس  
ملے کو دوسرا زادی سے دیکھنے لگا تھا۔ میں وہاں جا کر گھروالوں کو  
روپیہ اور خوراک بھیج سکتا تھا اور ان کی زندگیاں خوشگوار بناسکتا تھا میں  
اس پہلو پر جتنا بھی غور کرتا مجھے اس میں اتنی ہی بہتری نظر آتی لیکن یہ بات  
میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ابتداء کیسے کر دوں۔ بھاگ جانے کے تصور  
نے مجھے اعصابی بنا دیا تھا لیکن بہر حال میں نے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔  
میں نے فیصلہ کیا کہ کسی کو اپنا رازدار نہیں بناؤں گا، حتیٰ کہ اپنے خاندان کو  
بھی نہیں۔ بعد میں انھیں خط لکھا جا سکتا تھا۔

اپنے فرار کی تیاریاں مکمل کرنے میں مجھے کوئی بفتہ لگ گئے۔ سب  
سے زیادہ ضرورت مجھے دو چیزوں کی تھی: نقدی اور چاول کے راشن  
کے کوئی پنچھیں صوبے میں دوسرے مقامات پر استعمال کیا جاسکے۔ نقدی  
حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے ہانگ کانگ کے ڈالر یاد آئے جو میرے  
باپ نے ایک بجس میں چھپا رکھئے تھے۔ بھوک کے بدترین ایام میں بھی  
میرے باپ نے یہ ڈالر خرچ نہیں کیے تھے۔ مبادا غیر ملکی کرنی ذخیرہ کرنے  
کے الزام میں اسے گرفتار کر لیا جائے۔ میں نے پانچ ڈالر لے لیے۔ ہلفاظ  
دیگر یہ ڈالر میں نے ادھار لیے کیونکہ باہر جا کر میں انھیں بوٹا سکتا تھا۔ ان  
ڈالروں کو بھانے میں مجھے کافی دن لگ گئے۔ میں نے سُنا تھا کہ یا انکنگ میں

ڈالروں کی بلیک مار کریٹ ہوتی ہے۔ بلیک مار کیلئے کچھ نوجوان تھے جو گھر ڈیوں، سائیکلوں اور کچھ اور چیزوں کی ناجائز درآمد کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے متعلق کسی سے دریافت کرنا خطرے کی بات ہے لیکن میں نے ان کا پستہ پوچھہ ہی لیا اور آخر ان میں سے میں نے ایک کو ڈھونڈ دھبھی لیا۔ پانچ ہنگ کانگ ڈالروں کے عوض انھوں نے مجھے چودہ یوآن دیے اور تین کھٹی چاول کے راشن کوپن۔

بھاگ نکلنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا میں نے سمجھا تھا۔ ایک شام کھیتوں سے گھر واپس آ کر میں نے پیالہ بھر چاول کھایا اور اپنی بیوی سے کہا کہ میں ٹھیلنے کو باہر جا رہا ہوں۔ مجھے جنوب میں شیکھی کے قبیلے کی طرف جانا تھا۔ میں تقریباً رات بھر چلتا رہا اور کھیتوں میں سونے کے لیے صرف چند ہی گھنٹے رکا۔ بھر میں بس میں سوار ہو کر شیکھی پہنچا۔ وہاں میں نے ایک خواجہ والے سے پیالہ بھر سوئیاں خریدیں اور ایک اور بس میں سوار ہو گیا۔ رات ہونے تک مجھے دور پہاڑ پر سے میکاؤ کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ میں کچھ دیر اور چلا۔ ایک گاؤں میں تھوڑا بہت کھانا کھایا اور باقی دن سو کر گزارنے کے لیے پہاڑیوں پر چلا گیا۔ اس رات بھر میں میکاؤ کی روشنیوں کی طرف چلتا رہا حتیٰ کہ میں دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ میں کوئی اچھا تیراک نہیں ہوں لیکن تھوڑا بہت تیرنا ضرور جانتا ہوں۔ میں پانی میں اتر گیا، جہاں تک تیر سکا، تیرتا رہا، بھر میں نے پانی پر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور کچھ دیر بعد بھر تیرنے لگا۔ دریا پر مجھے کمی کشتیاں ملیں۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب میں اتنا تھا کہ گیا ہوں کہ تیر نہیں سکتا تو ایک کشتی کے

تریب پہنچا۔ مجھ سرے نے مجھے سہارا دے کر کشٹ میں سوار کر لیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ کہیں مجھے واپس نہ لے جائے۔ میرے پاس جنا روپیہ تھا وہ میں نے اس کے حوالے کر دیا اور گلے کپڑوں کے ساتھ ہی سوگیا۔ اگلی صبح کشٹ میکاؤ میں لنگر انداز ہوئی اور مجھ سرے نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔ پولیس کے ہیڈ کوارٹر میں میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری طرح اور بھی بہت لوگ رات بس آگ کر میکاؤ پہنچ گئے تھے۔